وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے

جلد 8	شمارہ 08	شوال 1435ھ	اگست 2014ء

ISSN 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: سعد حسن خان

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اختر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام: انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرتعاون سترہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 400 روپے، قیمت فی شمارہ 40 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

www.hamditabligh.net

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس فوارہ چوک جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ متاع ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات	سورۃ التکویر	3
2	بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات		5
3	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	6
	قرآن کی شان (نظم)	قاضی عبدالدائم دائم	17
4	پاکستان میں اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا فیضان	پروفیسر حمزہ نعیم	18
5	امن کی آشا	رفیق چودھری	23
6	تعلیم اور قومی شعور	پروفیسر سید محمد سلیم	32
7	ڈی این اے	انجم اقبال	41
8	تبصرہ و تعارف کتب		52

ماہنامہ حکمت بالغہ میں قلمی تعاون کرنے والے حضرات کے مضامین معلومات کے تبادلے اور وسیع تر انداز میں خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے لیے چھاپے جاتے ہیں ادارے کا مضمون نگار حضرات سے تمام جزئیات میں اتفاق ضروری نہیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

سورۃ التکویر 81 (رکوع 1، آیات 29)

اس سورت مبارکہ میں اوّلاً ظہورِ قیامت کے وقت پیش آنے والے احوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدائی چھ آیات میں ذکر ہے کہ وقوعِ قیامت کے وقت (جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو) کس طرح ساری کائنات کو فنا کر دیا جائے گا۔ اگلی سات آیات میں ذکر ہے کہ اس کے بعد (جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو) کیا کیا واقعات رونما ہوں گے۔ اور پھر بتایا ہے کہ اس دن ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے!۔ اس کے بعد کی آیات میں قرآن مجید کی عظمت اور صاحب قرآن ﷺ کی رسالت کا بیان ہے کہ اس قرآن کو لے کر آنے والا معزز فرشتہ ایسا ایسا ہے اور جن پر یہ نازل ہوا یعنی حضرت محمد ﷺ، وہ نہ مجنوں ہیں نہ کاہن ہیں نہ صاحب غرض ہیں اور علاوہ اس کے انہوں نے وحی لانے والے فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لہٰذا اسے پہچانتے بھی ہیں۔ ان دلائل سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ قرآن، اللہ کا کلام ہے اور آپ ﷺ، اللہ کے رسول ہیں تو پھر یہ انکار کرنے والے کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ یہ قرآن تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے بالخصوص اُس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہتا ہو۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ O وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ O

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے

وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ O وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ O

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

اور جب (دس مہینے کی) حاملہ اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی

وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ O

اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے

وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ O

اور جب دریا آگ ہو جائیں گے

وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ O

اور جب روحیں (بدنوں سے) ملا دی جائیں گی

وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ O بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ O

اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنائی گئی ہو، پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماردی گئی؟

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ O وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ O

اور جب (عملوں کے) دفتر کھولے جائیں گے

اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی

وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ O وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ O

اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔ اور بہشت جب قریب لائی جائے گی

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ O

تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے

صَدَقَ اللّٰہُ الۡعَظِیۡم

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات

اِجْعَلُوْا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ النَّارِ حِجابًا وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ

اپنے درمیان اور دوزخ کے درمیان کوئی رکاوٹ بناؤ اگرچہ کھجور کا ٹکڑا (صدقہ کرنے) کے ذریعے سے۔

(طبرانی، عن فضالۃ بن عبید رضی اللہ عنہ)

أَجْمِلُوا فِي طَلَبِ الدُّنْيا فَإِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا كُتِبَ لَهُ مِنَها

رزق کمانے میں اچھا انداز اختیار کرو، کیونکہ ہر شخص کو اِس میں سے وہی میسر ہوتا ہے جو اس کے لیے (مقدر میں) لکھ دیا گیا ہے۔ (ابن ماجہ، عن ابی حمید الساعدی رضی اللہ عنہ)

اِجْعَلُوْا مِنْ صَلاتِكُمْ فِي بُيُوْتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا

اپنے گھروں میں بھی کچھ نماز (سنت اور نوافل) ادا کیا کرو اور ان کو قبریں نہ بناؤ۔ (متفق علیہ، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

الجَامِعُ الصَّغِيْر فی احادیث البشیر والنذیر، للامام جلال الدین السیوطی رحمہ اللّٰہ

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

انجینئر مختار فاروقی

1

قائداعظم محمد علی جناح کی 11/اگست 1947ء کی تاریخی تقریر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے

1 بیسویں صدی کے عین وسط میں، جبکہ عالمی مغربی صہیونی استعمار اپنے جوبن پر تھا اور اس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، دنیا کے نقشے پر دنیا کی پانچویں بڑی طاقت اور سب سے بڑی مسلم ریاست پاکستان کا نام آ جانا ـــــ جہاں ایک محیّر العقول واقعہ ہے وہیں ولولوں اور جذبوں سے لبریز ایک طویل تاریخ کے سفر کا منطقی نتیجہ بھی ہے اور تقسیم ہند کے نتیجے میں عظیم ترین مسلم ریاست کا قیام ـــــ ایک طرف عالمی مغربی صہیونی استعمار کے مسلمانوں کے خلاف ظالمانہ اور منظّم تشدد کے عمل کا یقینی اور ٹھوس نتیجہ تھا ـــــ دوسری طرف عالمی استعمار نے ہند اور باقی دنیا کے عوام کے لئے جو لادینیت پھیلائی تھی اس کے مدّ مقابل خداپرستی اور آسمانی ہدایت کی طرف ایک قدم بھی تھا۔

2 مشہورِ زمانہ کتاب 'تہذیبوں کا تصادم'(CLASH OF CIVILISATIONS) کا مصنف سیموئل پی ہنٹنگٹن برملا لکھتا ہے (اور یہ شذرہ حکمت بالغہ کے صفحات میں متعدد بار آ چکا ہے) کہ

''مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا، بلکہ اس وجہ سے فتح کیا کہ منظّم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کر سکتے.....''

1750ء سے لے کر 1920ء تک کا یہ منظّم تشدد کا سفر ـــــ خود ظالم کے ضمیر کے اندر ایک خلش (GUILTY CONSCIENCE) پیدا کر رہا تھا اور فرعونوں کے آج سے 3300 سال قبل بنی اسرائیل (THE CHILDS OF ISRAEL) پر ظلم، تشدد، بربریّت کے علی الرغم، خالق ارض وسما کے ایک اٹل اُصول کی باطنی خلش اور بے چینی کو بڑھا رہا تھا کہ اسی محکوم قوم میں سے کوئی 'رہنما' اُٹھے گا جو فرعونوں کے اقتدار کے 'غرقاب' ہونے کا باعث بن جائے گا۔ (مغرب یونانی اور رومی منظّم تشدد کا علمبردار ہے اپنے ہاں اُنہوں نے یہ طور طریقے ختم کر دیے مگر محکوم قوموں کیلئے یہ طریقے جنگ عظیم اوّل کے بعد تک جاری رہے۔ (دیکھئے انوار القرآن مطبوعہ قرآن اکیڈمی لاہور)

عالمی مغربی صہیونی استعمار اسی لئے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے بے مثال جذبہ حریت اور جدوجہد آزادی سے خائف تھا اور اس لئے تقسیم ہند پر آمادہ ہو کر مسلم اکثریت کے علاقے مسلم لیگ کے زیر اقتدار دینے پر آمادہ ہو گیا۔

3 یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ عالمی مغربی صہیونی سامراج نے جنوبی ایشیا میں اقتدار ـــــ مسلمانوں سے چھینا تھا، ہندوؤں کو تو اس سامراج نے خود اپنی اشیر باد اور شفقت دے کر مسلمانوں کے مدمقابل مقامی لوگوں میں غدار تلاش کرنے کی 'معدن' کے طور پر تیار کیا تھا۔ لہٰذا 1947ء میں تقسیم ہند کا مرحلہ دو صدیوں کے ناجائز غاصبانہ قبضے کی واپسی کا وقت تھا اور خدا بیزار اور دین دشمن صہیونی سامراج بادل نخواستہ مسلمانوں سے چھینی ہوئی حکومت چند صدیوں میں ایک حصہ واپس دے کر تسلی دے رہا تھا کہ بس یہی کافی ہے ہمیں ہندو کو بھی راضی رکھنا ہے۔

تیسری طرف یہی وقت ہے کہ لوہا گرم تھا اور مشرقِ وسطیٰ میں جنگ عظیم اوّل میں جرمنی کی اتحادی سلطنت عثمانیہ کو تاوان جنگ میں تقسیم کر کے، کئی غداروں کو خوش کر کے اور (یورپی اقوام کے ناجائز بچہ) اسرائیل کا قیام ممکن بنایا گیا تھا، وہ وقت اب سر پر آ گیا تھا اور

لارنس آف عربیا کی محنت اب رنگ لانے والی تھی (واضح رہے 3/جون کے اعلان تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے ایک سال کے اندر مئی 1948ء میں ریاست اسرائیل قائم ہوگئی۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مئی۔جون 1947ء میں قیامِ اسرائیل کا منصوبہ کس نازک مرحلہ پر تھا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی جدوجہد کی طوالت مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا کرسکتی تھی۔) لہٰذا صہیونی منصوبہ سازوں کہ نزدیک تقسیم ہند سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے جذبات کی تسکین ـــــ برطانوی حکومت کی خواہش کے علی الرغم تبھی ممکن ہوسکی۔

4 عالمی حالات کا یہ منظرنامہ ہے۔ علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر سے بھی یہ حقائق پوشیدہ نہیں تھے جنہوں نے 1936ء میں 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' نامی نظم لکھ کر سارے صہیونی منصوبے کو سامنے رکھ دیا تھا اور قائداعظم سے بھی مخفی نہیں تھا۔

لہٰذا ـــــ 3/جون 1947ء کے فیصلے اور اعلانِ تقسیم ہند کے بعد کے حالات پر برطانیہ کانگریس کو کیسے مطمئن کررہا تھا اور صہیونی دماغ پاکستان کے قیام پر تاریخی دباؤ کے نتیجے میں راضی ہونے کے علی الرغم اس منصوبے کو کمزور کرنے، مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی پیدا کرنے اور پاکستان کے قیام کے جلد ہی بعد 'ناکام تجربہ' ثابت ہونے کے جو منصوبے بنائے جارہے تھے اور ہندو اس میں پیش پیش تھا وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہیں۔

☆ پنجاب کی تقسیم میں سکھوں کے ذریعے اس تقسیم کے عمل کو خونیں اور رنگین بنادیا گیا جو مسلمانوں کی قربانیوں کی تاریخ کا ایک جھومر سہی۔ سکھوں کے لئے کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں تھا۔

☆ یہی حالات سندھ اور بنگال میں بھی ہوسکتے تھے مگر وہاں ایسا کوئی 'جنگجو' ہندو حمایتی گروہ موجود نہیں تھا مسلمان اور غیر مسلم صدیوں سے اچھے پڑوسیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ لہٰذا ـــــ ان دونوں علاقوں میں ایک نئی چال کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دور کا پریس گواہ ہے کہ مسلم بنگال اور مسلم سندھ سے ہندو اقلیت بالارادہ منظم طور پر منتقلی آبادی کے منصوبے کو ناکام بنانے پر کام کررہی تھی چنانچہ بنگال سے بھی خبریں آرہی تھی کہ ہندو اقلیت 'بھارت' جانے سے گریزاں ہے اور سندھ میں بھی ہندو اقلیت اسی طرح کی سوچ رکھتی تھی۔

☆ سازشی ہندو ذہن نے ریاست حیدرآباد (دکن) کے لئے الگ منصوبہ بنایا، ریاست

جونا گڑھ (جہاں سومنات کا مندر ہے اور اہم بندرگاہ) کے لیے علیحدہ سازش تیار کی۔ منادر اور کشمیر کے لئے الگ راستہ اختیار کیا گیا۔

☆ قائداعظم محمد علی جناح کو دہلی میں یہ خبریں مل رہی تھیں مگر جب وہ دہلی سے کراچی پہنچے تو ان خبروں کے پیچھے جو ایک واضح سازش اور چال کارفرما تھی ملاقاتوں میں اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ کراچی سندھ کا اہم ساحلی شہر تھا اور حیدرآباد صدیوں سے مسلم حکمرانوں کا دارالحکومت کہلاتا تھا۔ قائداعظم کے نزدیک سندھ سے ہندوؤں کا بھارت کی طرف نقل مکانی نہ کرنا ـــــ پاکستان دشمنی اور ریاست پاکستان کے 'دل' کراچی میں ہی رہ کر اس کا گلا گھونٹنے کے مترادف تھی ہندو منصوبہ یہ تھا کہ پاکستان کے قیام کے جلد ہی بعد سندھ اور بنگال میں ہندو (بڑی اہم) اقلیت ہوں گے لہٰذا ـــــ وہ حالات کے مطابق پاکستان کے ایک صوبہ سندھ کو تقسیم ہند کے اُصول کے تحت دوبارہ تقسیم کرنے کی تحریک چلا کر یہ ممکن بنالیں گے۔ (جیسا کہ بنگلہ دیش میں پاکستان کے قیام کے بعد سے ہندوؤں نے مسلمانوں کو مسلسل پریشان کیا تھا اور بالآخر بنگلہ دیش کا قیام عمل میں لے آیا گیا۔) ملکی پریس میں اب بھی سندھ میں نئے صوبہ کے قیام کی بازگشت کبھی کبھی اب بھی سننے میں آجاتی ہے۔

5 اس پس منظر میں قائداعظم محمد علی جناح نے ایک طرف یہ بات کہی کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتیں مثالی مذہبی آزادی کا تجربہ کریں گی اور دوسری طرف واضح الفاظ میں اس ممکنہ تحریک ـــــ 'سندھ کی تقسیم ثانی' کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا کہ صہیونی سامراج نے تقسیم ہند کا اُصول مانا ہے تو اس وجہ سے کہ اس نے چند صدیاں قبل یہ علاقے مسلمان حکمرانوں سے غصب کئے تھے لہٰذا پورا برطانوی ہند مسلمانوں کو واپس کرنے کی بجائے صرف مسلم اکثریت کے علاقے مسلمانوں کو اور ہندو اکثریت کے علاقے ہندوؤں کو دینے پر آمادگی ہی تقسیم کا فارمولا اور بنیاد تھی۔

یہ ـــــ اُصول دوبارہ سندھ اور بنگال پر لاگو اس لئے نہیں ہوسکتا تھا کہ اب پاکستان کی حکومت نے کسی سے حکومت چھینی نہیں ہے اور مسلمان اکثریت کے علاقوں پر مروجہ معروف عالمی معیارات کے مطابق ریفرنڈم ہوا جو برطانوی حکومت نے اپنے زیر اہتمام کرایا (اس میں ہندو کی حمایت میں کتنی دھاندلی کی ہوگی؟) اور ثانیاً پھر منتقلی آبادی کا فیصلہ ہوا کہ مسلم اکثریت کے

صوبوں سے غیر مسلم یعنی ہندو اور ہندو اکثریت کے علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے بھارت یا پاکستان چلے جائیں گے۔ لہٰذا مسلم اکثریت کا علاقہ سندھ یا بنگال جس سے غیر مسلم اقلیت ہندو اگر بھارت ہجرت نہیں کر رہی تو یہ اس کی اپنی آزاد مرضی تو ہو سکتی ہے یا سازش مگر کسی کا جبر نہیں کہہ سکتے یہ 'تقسیم ہند' کا فارمولا ـــــ دوبارہ جنوبی ہند میں کبھی لاگو (APPLY) نہیں ہو سکتا۔

---

6 چنانچہ غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ کے ضمن میں آپ (قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمہ) نے فرمایا کہ

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan."

''آپ آزاد ہیں' آپ کو اپنے معبدوں میں جانے کی اجازت ہے' پاکستان کی اس ریاست میں آپ کو اپنی مساجد یا کوئی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی آزادی ہے''

ـــــ غیر مسلم اقلیتوں کے لئے یہ فراخدلانہ اعلان قائداعظم محمد علی جناح کی طرف سے کسی مغربی پراپیگنڈے اور بیسوی صدی کے صہیونی استعمار کے نصف النہار کی چکاچوند میں نہیں کہا گیا تھا بلکہ ـــــ مسلمانوں کے 800 سالہ شاندار اور بے داغ ماضی کی بنیاد پر تھا۔ (جیسا کہ مغلیہ عہد میں غیر مسلم اقلیتیں نہایت عزت واحترام سے وقت گزارتی رہی ہیں اور آج بھی پاکستان میں بے شمار مذہبی ہندو اوقاف مغل حکمران اورنگ زیب کی عطا کردہ جاگیروں پر قائم ہیں ـــــ وہ اورنگ زیب جو ہندو کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔)

اقلیتوں سے حسن سلوک کے ضمن میں مسلمانوں کا ماضی چاہے خلافت راشدہ کا ہو، چاہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ یا بعد کے جنوبی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں ـــــ وہ سب ایک سنہری تاریخ رکھتے ہیں۔

دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"You will find that in course of time Hindus would ccease to be Hindus and Muslims would cease to be

Muslims, not in the religious sense, becuase that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the State."

''آنے والے دور میں آپ دیکھیں گے کہ ہندو اور مسلمان مذہبی معنوں میں ہندو اور مسلم نہیں کہلائیں گے کیونکہ یہ ان کا ذاتی ایمانی معاملہ ہے بلکہ سیاسی معنی میں ریاست کے شہریوں کے طور پر ہندو اور مسلم کہلائیں گے۔''

جس میں ہندو اقلیت کے سازشی ذہن کی طرف اشارہ ہے کہ تقسیم ہند کا فارمولا ـــــ اب دوبارہ کبھی لاگو نہیں ہوگا، کہ نہ عالمی استعمار کی طرح کے قبضے سے کسی علاقے پر مسلمانوں نے قبضہ کیا ہے اور نہ محکوم اس اُصول کو اپنا کر اپنی آزادی اور علیحدہ ریاست در ریاست کا مطالبہ کر سکیں گے۔ قائداعظم محمد علی جناح صاحب کی مذکورہ تقریر کا اصل متن بذریعہ انٹرنیٹ اس ویب پر دیکھا جا سکتا ہے: www.pakistani.org/pakistan/legislation/constituent_address_11aug1947.html

---

ہمارے نزدیک قائداعظم صاحب کی بے شمار ایسی تقاریر اور بیانات کو نظر انداز کر کے جو کہ پاکستان کو ایک مثالی جدید اسلامی ریاست بنانے کے حق میں ہیں صرف 11/اگست 1947ء والی تقریر کو بنیاد بنا کر سیکولر پاکستان کا ڈھنڈورا پیٹنا ہی ـــــ دراصل ہندو اقلیت کے دماغ میں ایک پرورش پانے والی سازش کے ناکام ہونے کے دُکھ کا اظہار ہے جو چاند پر تھوکنے یا کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی طرح کیفیت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قولِ مبارک ہے کہ

''حق وہاں تلاش کرو جہاں دشمنوں کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔''

لہٰذا ـــــ 11/اگست کی تقریر ـــــ کا پہلے چھپنا اور پھر اس پر تنقید اور بعد ازاں سیکولر طبقے کا اس قضیہ کو ایک مہم بنا کر دشمنوں کی طرف سے آمدہ رقوم سے چلنے والی NGO's کے جھولوں میں آرام سے جھولتے جھولتے کبھی کبھار سیکولرازم کا یہ بیان بھی داغ دینا ـــــ سازشی ہندو ذہن کی ایک گہری سازش کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

2

مسلم لیگ (ن) کی حکومت اور حکومت مخالف تحریکیں

1998ء اور 2014ء کے حالات میں حد درجہ مماثلت و مشابہت

آج سے کوئی پندرہ سولہ سال پہلے بھی اس ملک خداداد پاکستان میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت تھی اور کچھ دیدہ اور بعض نادیدہ وجوہات کی وجہ سے کوئی عناصر حکومت کو گرانے میں مصروف تھے۔

عین اسی طرح کی صورتِ حال 2014ء کے اوائل سے مسلم لیگ (ن) کی موجودہ حکومت کے خلاف بھی بعض عناصر نے جمع ہو کر پیدا کر دی ہے۔

☆ پہلے مذہبی میدان میں ایک انقلاب آفرین شخصیت قابل احترام مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی تھی اور ان کی سحر بیانی نے ملک کے طول و عرض میں 'رب کی دھرتی، رب کا نظام' کا نعرہ عام کر دیا تھا وہ جگہ جگہ جلسے کر رہے تھے اور لوگوں سے ہاتھ کھڑے کروا کر گویا بیعت لے رہے تھے کہ وہ جلدی کال (CALL) دیں گے اور اسلام آباد پر دھاوا بول دیا جائے گا اور 'شریعت یا شہادت' کا بڑا مسحور کن "CATCH WORD" مسلمانانِ پاکستان کے لئے تراشا گیا تھا۔

زیادہ دیر کی بات نہیں بہت سے لوگ میڈیا اور اہل علم میں سے یقیناً ان واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ اُنہوں نے اسلامی انقلابی محاذ بنایا تھا اور مختصر وقت میں حالات کو گرما دیا تھا۔

☆ آج کے حالات میں ان کے متبادل ایک شخصیت جناب علامہ طاہر القادری صاحب ہیں ان کا نعرہ بھی انقلاب کا ہے اور عوام کو اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے کی اپیل کے ساتھ 14/اگست 2014ء کا وقت دے رکھا ہے۔ بظاہر حالات ایسے ہیں کہ حکومت کا بے بس عوام اور انقلاب کا نعرہ دینے والی قیادت میں تصادم کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ سیاسی و تحریکی گرما گرمی ہے اور سیاسی درجہ حرارت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اِدھر رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور شمالی وزیرستان میں ایک فوجی آپریشن بھی جاری ہے۔ گھر سے بے گھر یہ آٹھ لاکھ افراد بھی بظاہر 14/اگست 2014ء کے اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے کے دن کا انتظار کر رہے ہیں۔

ڈیڑھ عشرہ قبل کے حالات میں بھی جذبات کا ہیجان اور تیزی اسی طرح تھی جو آج نظر آرہی ہے۔ملک کے تمام بڑے شہروں میں اجتماعات منعقد ہو رہے تھے۔پنجاب کے ایک معروف ضلعی صدر مقام میں ایک ریلی سے قائد انقلاب مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کا خطاب تھا۔مقامی انتظامیہ نے کسی بات پر مولانا پر جلسہ جلدی ختم کرنے کے لئے دباؤ ڈالا اور سختی کی۔مولانا اعوان صاحب نے فرمایا ڈی سی صاحب چند مہینوں کی بات ہے پھر آپ ہم سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکیں گے۔اسی طرح کی زبان اور لہجہ آج کے قائد انقلاب اور اُن کے شریک کار شیخ رشید صاحب اور ان کے دوسرے اعوان وانصار اختیار کئے ہوئے ہیں۔

☆ مسلم لیگ (ن) کی سابقہ حکومت اور آج کے حالات میں ایک اور مشترک بات جناب پرویز مشرف صاحب کی شخصیت ہے۔اس وقت در پردہ کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا ہمیں کیا معلوم ـــــ مگر 'رب کی دھرتی رب کا نظام' کا نعرہ لگا کر حالات میں تیزی لانے کے جتنے جتن کئے گئے تھے اس کا فائدہ جناب مشرف صاحب نے اُٹھایا۔اور ـــــ آج وہی مشرف صاحب ملک میں مقدمات کا سامنا کر رہے ہیں اور ان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ق لیگ کے زعماء جناب شیخ رشید صاحب پر پرویز مشرف صاحب کی مہر لگی ہی ہوئی ہے جناب طاہر القادری نے آج کے منظر نامے میں مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی پوزیشن سنبھال لی ہے۔دیکھئے ـــــ حالات کا اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔کہتے ہیں کہ اُونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی لہٰذا ـــــ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ سیاسی اُبال اور اسلام آباد کی طرف مارچ کے اعلان سے پیدا ہونے والی افراتفری سے کون کیا فائدہ اُٹھاتا ہے۔

☆ ایک بات طے ہے کہ پندرہ سولہ سال قبل کے حالات میں لگایا گیا نعرہ 'رب کی دھرتی رب کا نظام' اور آج کے حالات میں 'تبدیلی' کی خواہش اور انتخابات نہیں 'ریاست بچاؤ' کے نعرہ کا حال بہت حد تک ایک جیسا ہی ہونے والا ہے۔

شاید کچھ زرداریوں، بے نظیریوں، چوہدریوں، شیوخ اور وزارت کے لئے نئے چہروں کے حالات میں تبدیلی آجائے۔مگر حبیب جالب مرحوم اور جناب معراج خالد مرحوم جیسے لوگوں اور ملک کے سسکتے بلکتے عوام کے شب وروز میں بظاہر کسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آرہے۔(واللہ اعلم بالصواب)

3

کہاں اگست 1947ء ــــ اور ــــ کہاں اگست 2014ء

جنوبی ایشیا میں گزشتہ چار صدیوں کی اسلام کی احیائی کوششوں کا بارگراں بالآخر حالات نے مسلمانانِ پاکستان کے ناتواں کاندھوں پر لاڈالا ہے۔ سیاسی تاریخ کا یہ ایک اہم باب ہے مگر مسلمانوں کا المیہ ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں سے آنے والا ہر دن اور ہر لمحہ مغربی استعمار اور صہیونی عالمی حکومت کی گرفت مزید مضبوط ہونے کی خبر لا رہا ہے، جس سے کسی اہم واقعہ کا اشارہ ملتا ہے۔

اگست 1947ء میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کے حالات اور اگست 2014ء میں پاکستان اور گرد و پیش کے جنوبی ایشیا کے مسلمان ممالک کے حالات کا بغور مطالعہ کئی اہم حقائق منکشف کر رہا ہے۔ دشمن مسلمانوں کو ہر چہار سمت سے فوجی، سیاسی، جغرافیائی، سفارتی اور معاشی سطح پر گھیرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس وقت عالمی صہیونی حکومت کا 'تاج' تاجِ برطانیہ تھا اور وہ مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام سے مل کر بے دست و پا بنا رہا تھا اور آج عالمی صہیونی حکومت، نئے ورلڈ آرڈر کے ساتھ 'یو این او' کے جھنڈے تلے عالمی حکومت قائم کئے امریکی قیادت میں ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر عالمی معاشی گِدھوں (INTERNATIONAL ECONOMIC VULTURES) کے سامنے ڈالنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔

تاہم اگست 1947ء اور اگست 2014ء کے منظر نامے میں خود مسلمانوں کی صفوں میں بعض اجتماعی کیفیات کا نمایاں فرق ہے۔ چند اہم باتوں کا تذکرہ قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اگست 1947ء	اگست 2014ء
☆ مسلمانوں میں مسلم لیگ کے پرچم تلے اتحاد تھا اور مسلمان ڈھاکہ سے طورخم تک متحد اور ایک قوم نظر آ رہے تھے۔	☆ مسلمان جنوبی ایشیا میں تو کیا متحد ہوں گے صرف موجودہ پاکستان میں بھی فرقوں، برادریوں اور نظریاتی پارٹیوں میں منقسم ہیں۔

☆ مسلمانوں کے درمیان (ہر دور میں موجود) سیکولر اور لادین طبقہ دبا ہوا تھا اور بے عملی دکھاتے ہوئے دفاعی پوزیشن میں تھا اور مخلص مسلمانوں کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔

☆ سیکولر اور لادین طبقات نمایاں، موثر اور جارحانہ انداز میں (AGGRESSIVELY) کام کر رہے ہیں۔ عالمی صہیونی استعمار پہلے بھی اس کی پشت پر تھا اور آج بھی ہے اور مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر اثر ہے۔

☆ جنوبی ایشیا کے تمام مسلمان فرقہ واریت سے بہت بلند ہو کر آزاد مسلم ریاست کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور باہمی اتحاد، یگانگت اور بھائی چارہ مثالی تھا۔

☆ صرف پاکستان کے اندر لوکل مہاجر جھگڑے، سندھی پنجابی، پنجابی پختون اور پنجابی بلوچ آویزش کے علاوہ شیعہ سنّی اختلافات، مسلکی انتہا پسندی کے علاوہ مذہبی برداشت کا فقدان زوروں پر ہے۔

☆ مسلمان دشمنوں (ہندوؤں برطانوی حکومت وغیرہ) کے پراپیگنڈے اور لڑانے کے ہتھکنڈوں کے خلاف سینہ سپر تھے اور دشمن اپنے عزائم میں ناکام دکھائی دیتا تھا۔

☆ مسلمان اپنے اندر دشمنوں کے ایجنٹوں، NGO's، غیر ملکی امداد، غیر ملکی دورے اور غیر ملکی میڈیا (از قسم بی بی سی اور VOICE OF AMERICA) کے جارحانہ انداز سے باہم دست و گریباں ہیں اور ڈالروں کی بھرمار ہر سطح پر اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

☆ برطانوی ہند کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی قیادت میں ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کی فضا غالب تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح انگریزی بولتے تھے۔ مسلمان عوام ان کے خطابات کو سمجھتے نہیں تھے مگر ان کے ہر لفظ کو

☆ آج پاکستان میں کئی سیاسی پارٹیاں ہیں اور کئی مزاحمتی گروپ (PRESSURE GROUPS) ہیں۔ پھر لوگوں میں سے بعض باہمی بداعتمادی کی فضا کے باعث اپنے مطالبات کے لئے ہتھیار اُٹھا لیتے ہیں

اپنے دل کی آواز سمجھتے تھے۔عوام اور قیادت میں نظریاتی ہم آہنگی اور یگانگت مثالی تھی۔

☆ مسلمان عوام اپنی قیادت کے اشارے اور حکم پر ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کو تیار تھے (جیسے قیامِ پاکستان کے موقع پر مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں مسلمانوں نے بے نظیر مثالیں پیش کیں) اس وقت جنوبی ہند میں مسلم لیگ کے رہنما قائداعظم محمد علی جناح خواجہ ناظم الدین، نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر تھے۔جن کے پائے کے لوگ بعد میں ہمیں نصیب نہ ہو سکے۔

قیادت اور عوام میں باہمی اعتماد کا فقدان انتہائی کم درجے پر ہے اور کوئی قومی لیڈر اس وقت عوام کے نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے نہیں ہے۔سب اپنے مفادات کے لئے سرگرم عمل ہیں اور مسلم عوام پریشان ولاچار ہیں۔

☆ آج کوئی قومی قیادت نہیں علاقائی لیڈر ہیں وہ لیڈر بھی ملک سے باہر دشمنوں کی گود میں بیٹھے ہیں۔ان کے کہنے پر آئے روز فساد اور باہمی قتل و غارت کے میدان سج جاتے ہیں (جیسے کراچی وغیرہ) مگر مسلمانانِ پاکستان اُمت کے اجتماعی مفاد اور مثبت سوچ کے حامل کسی 'مردِ راہ دان' کے آج بھی منتظر ہیں۔

اور ـــــ آج اگست 2014ء میں مسلمانانِ پاکستان اور ہماری چوٹی کی قیادت، کھلنڈرے، مفاد پرست اور غیر نمائندہ لوگ ہیں جن کی بصیرت و بصارت کی صورتِ حال یہ ہے:

ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اللہ تعالیٰ پاکستان (جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے خوابوں کی سرزمین) اور اہل پاکستان پر رحم فرمائے اور صحیح قیادت عطا فرمائے۔

اللھم اید الاسلام والمسلمین بالامامِ الحکم العادل

اے اللہ اسلام اور مسلمانوں کی عادل حکمران کے ذریعے مدد فرما۔آمین

غور فرمائیں ـــــ اور ـــــ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائیں۔

شانِ قرآن کریم

قاضی عبدالدائم دائم (ہری پور ہزارہ)

حق تعالیٰ کا کلامِ حق نما قرآن ہے
اہل حق کا ہر قدم پر رہنما قرآن ہے

جیسے موتی، لعل، ہیرے ہوں جڑے صفحات پر
ایسے حرفوں، ایسے لفظوں سے لکھا قرآن ہے

کلیاں پھولوں کی ہوں جیسے جا بجا بکھری ہوئی
ایسے زیروں، زبروں، پیشوں سے سجا قرآن ہے

جگمگاتی سیدھی سطریں ہیں کہ شمعیں صف بصف
جن کی لو سے تابناک و پر ضیا قرآن ہے

چاند، سورج، تاروں جیسی آیتیں چھوٹی بڑی
جن کی ضو سے روشنی پھیلا رہا قرآن ہے

سورتیں اس کی شفاعت میں رہیں گی پیش پیش
بالیقین اک شافع روزِ جزا قرآن ہے

اک نرالی سر سے، لے سے، لہجے سے آراستہ
اک انوکھی طرزِ آواز و صدا قرآن ہے

مل کے بھی سب جن وانساں لا نہیں سکتے مثال
حامل ایسی معجزانہ شان کا قرآن ہے

انفرادی ، اجتماعی الجھنوں کا خاتمہ
یعنی تعبیر نظامِ مصطفٰے قرآن ہے

جسم وجاں کے، روح ودل کے ہر مرض کا ہے علاج
صحت و قوت ، توانائی ، شفا قرآن ہے

جوش ، جذبہ، ولولہ، جرأت، حرارت، زندگی
مردہ دل کے واسطے آبِ بقا قرآن ہے

کفر پر یلغار ہے ، حق کی اُٹھی تلوار ہے
سینۂ باطل میں تیر بے خطا قرآن ہے

اہل ایماں کے لیے بارانِ رحمت سر بسر
داعی ہمدردی و مہر و وفا قرآن ہے

چھٹ گئیں تاریکیاں، پھیلا اجالا چار سو
گمرہی کی شب میں صبح جانفزا قرآن ہے

جس کے پھولوں، پتیوں پر آ نہیں سکتی خزاں
گلشن ایسا مہکا ، لہکا اور کھلا قرآن ہے

ناز کر اپنے مقدر پر ، ملی تجھ کو یہ شان
تیرے اندر اترا اے غارِ حرا! قرآن ہے

کی بیاں صدیقہ نے کیا خوب تفسیر خلق
مصطفٰی صل علیٰ کی ہر ادا قرآن ہے

ہے شہیدانِ جفا میں ایک ایسا بھی شہید
جس کے سر نے نوکِ نیزہ پر پڑھا قرآن ہے

ہو نہ کیونکر دل میں جبریل امیں کا احترام
جب لبوں پر ان کا ہی لایا ہوا قرآن ہے

اس کو سمجھو اور پڑھو ترتیل سے ، پھر دیکھنا!
کس قدر دیتا سکوں، راحت، مزا قرآن ہے

ہوں محمد مصطفٰے پر تا ابد لاکھوں سلام
جن کے صدقے ہم فقیروں کو ملا قرآن ہے

جاگ دائم! جاگ، مولیٰ کو منا وقت سحر
سوتا ہے کیوں؟ یاد جب تو نے کیا قرآن ہے

پاکستان میں
اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا فیضان

پروفیسر محمد حمزہ نعیم
(سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ)

(بشکریہ ماہنامہ الخیر، ملتان، جون 2014ء)

خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہر طریق زندگی پر، ہر تہذیب، ہر معاشرت، ہر دین پر اسلام کو غالب کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی کے گیارہ سالوں میں 28 غزوات میں بنفس نفیس شرکت فرمائی۔ 56 مواقع پر اپنے شاگردانِ عزیز اپنے تربیت یافتہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو انہی میں سے ایک کو کماندار بنا کر اہل باطل کے مقابلے میں بھیجا..... بہت کم مواقع ایسے آئے کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست ہوئی ہو۔ فریقین یعنی اہل اسلام اور اہل باطل کا جانی نقصان حیرت انگیز طور پر بہت کم ہوا کیونکہ مار دھار مقصود نہیں تھی ہدایت مقصود تھی۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اعلیٰ کی طرف تشریف لے جانے کے بعد سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم و عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جہاد جاری رہا..... خلیفہ بلافصل سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ لاکھ مربع میل پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس وسعت کو دوگنا کر دیا اور سیدنا غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے چھوڑے ہوئے اسلامی رقبے کو دوگنا یعنی بائیس لاکھ مربع میل کو چوالیس لاکھ مربع میل تک وسیع کر دیا۔ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اہل نفاق کی سازشوں کی وجہ سے مزید وسعت نہ ہو سکی البتہ بلوچستان و سندھ کے بعض علاقے جو مفتوح ہونے کے بعد سرکش ہو گئے تھے انہیں دوبارہ

حلقہ اسلام میں لایا گیا۔ نواسۂ رسول سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے بشارت نبوی کے مطابق خلافت اسلامیہ کی باگ ڈور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دی اور تمام اہل اسلام نے اس اہم واقعہ کو عام الجماعت (سب مسلمانوں کے اکٹھے ہونے کا سال) کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب تمام اصحاب رسول اور اہل اسلام کے متفقہ امیر بن گئے تو انہوں نے پھر سے اسلامی سرحدوں کی وسعت پر توجہ مرکوز کی۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے چھوڑے ہوئے بائیس لاکھ مربع میل رقبے کو تین گنا یعنی حضرت ذی النورین عثمان رضی اللہ عنہ کے دیے ہوئے چوالیس لاکھ مربع میل میں مزید بائیس لاکھ کا اضافہ کر کے اب چھیاسٹھ لاکھ مربع میل پر پرچم توحید لہرا دیا۔

تاہم آج کی نشست میں ہم پاکستان اور اصحابِ رسول پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

زمانہ قدیم سے عرب تاجروں کے تعلقات سندھ اور جنوبی ہند سے رہے ہیں۔ مسلمانوں نے تجارتی اغراض سے مالدیپ، مالابار وغیرہ ساحلوں پر کئی بستیاں بسائیں، گجرات اور دکن کی بندرگاہوں میں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ بعد ازاں بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر مسلمانوں کو جوابی کارروائی کرنا پڑی۔ امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سے سب سے پہلے حضرت عثمان بن عاص ثقفی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بمقام تھانہ نزد بمبئی فوج کشی کی گئی مگر تھوڑی سی کامیابی کے بعد مسلمان واپس ہو گئے۔

خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں 23ھ میں حضرت عاصم بن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سیستان کا علاقہ فتح ہوا تھا۔ یہ علاقہ قبضے میں آنے سے سندھ سے لے کر دریائے بلخ تک کے علاقوں کی فتح کی کلید مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ سیستان کے مشرق میں سندھ اور جنوب میں مکران سے، مکران کا ایک بڑا علاقہ آج کے بلوچستان میں شامل ہے۔ 23ھ ہی میں حضرت حکم بن عمرو تغلبی کو مکران کا محاذ دیا گیا۔ وہ خوب جوش و جذبے سے بڑھے مکران کے حاکم راسل نے شکست کھائی اور مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ اسی جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہاب بن مخارق اور عبداللہ بن عتبان کو حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہم کی مدد کے لئے بھیجا تھا اور اسی موقع پر اہل سندھ نے مکرانیوں کی مدد کی تھی مگر شکست ہی ان کا مقدر بنی تھی۔ حضرت صحار عبدی فتح کی خوشخبری اور مالِ

غنیمت (خمس) لے کر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے تھے۔ امیر المؤمنین نے حسبِ معمول مفتوحہ علاقوں کا حال پوچھا تو حضرت صحار عبدی نے مشکلات کا ذکر کیا جس پر مجاہدینِ اسلام کو فی الحال آگے بڑھنے سے روک دیا گیا (طبری)۔ تاہم علامہ بلاذری نے فتوحاتِ فاروقی کی حد سندھ کے شہر دیبل تک لکھی ہے۔ (بحوالہ الفاروق رضی اللہ عنہ از علامہ شبلی نعمانی)

امیر المؤمنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فتوحات افغانستان کے علاقوں کابل، زابل اور غزنی سے پشاور تک پہنچی تھیں۔ ایک سفر کے دوران راقم السطور نے کابل میں دو بڑے صحابہ کا مزار دیکھا۔ کابل کے جنوب میں اُسی قبرستان میں سیدنا صدیق اکبر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے پوتوں کا اکٹھا مرقد مبارک دیکھا۔ شمالی وزیرستان میں وادیٔ شیر تلہ میں امیر بن احمد کا لشکر پہنچا تھا جہاں پہلے کفار کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مجاہدینِ اسلام کی فتح کے بعد یہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت مجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فوجی کیمپ تھا۔ اسی لشکر جہاد میں حسنین کریمین رضی اللہ عنہما بھی بغرضِ جہاد میں شامل تھے۔ (بحوالہ خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی ج3 ص201)

بلوچستان میں ضلع پنج گور میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ قبریں ہیں جو اشاعتِ اسلام ہی کی غرض سے یہاں تشریف لائے۔ خیال رہے کہ تاریخ کی کتابوں میں فتوح سندھ کے سلسلے میں 'ثغر' (سرحد) کا ذکر بار بار آتا ہے۔ وہ یہی ہے جسے چند سال پہلے تک صوبہ سرحد کہا جاتا تھا اس علاقہ کو ثغر (سرحد) اس لئے کہا جاتا رہا کہ زمانہ قدیم سے یہی علاقہ برعظیم ہند کی سرحد پر واقع تھا۔

دوسری طرف پاکستان کا مغربی قبائلی علاقہ کسی زمانے میں خراسان کا حصہ رہا ہے اور یہی وہ علاقہ ہے۔ جہاں آخری زمانے میں کفر و اسلام کی جنگ میں مجاہدین کے فتحیاب ہونے کی خوشخبریاں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آتی ہیں۔

خراسان کے غزوات میں خلیفہ سوم سیّدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت سعید رضی اللہ عنہ امیر عساکر تھے اور انہی غزوات میں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ جہاد میں شریک تھے۔ (طبقات ج7 ص101)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ثغر ہند کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن عامر بن کرز رضی اللہ عنہ امیر تھے

انہوں نے عبداللہ بن سوار عبدی کو بھیج کر علاقہ قیقان فتح کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد زیاد بن ابی سفیان نے منذر بن جارود کو سرحد کا والی بنایا۔ ان سے پہلے سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ علاقے فتح کئے تھے مگر یہ لوگ دوبارہ سرکش ہو گئے تو منذر بن جارود نے بوقان اور قیقان کے علاقہ میں جہاد کر کے ان لوگوں کو پھر سے اسلامی قلم رو میں داخل کیا۔ (فتح البلدان ص 440) اس نام کے علاقے بلوچستان ہی میں تھے۔

حضرت عبداللہ بن عامر کے بعد زیاد بن ابی سفیان بصرہ کے والی بنائے گئے تو انہوں نے سرحد ہند پر راشد بن عمرو جدیدی کو عامل بنایا۔ علاوہ ازیں انتظامی معاملات کے لئے سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری دی گئی (فتوح البلدان ص 439)۔ نیز زیاد بن ابی سفیان نے سندھ کے علاقہ پر سنان بن سلمہ بن محبق ہذلی رضی اللہ عنہ کو حاکم بنایا جنہوں نے مکران کو فتح کیا (فتوح البلدان، تاریخ یعقوبی ص 234)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب عبداللہ بن سوار عبدی کو والی مقرر کیا تھا اسی دوران عبداللہ بن عامر نے کابل فتح کیا۔ اِسی جہاد میں حضرت ابوقتادہ عدوی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

راشد بن عمرو جدیدی نے سندھ کی طرف پیش قدمی کی اور دور تک اندر چلے گئے (تاریخ خلیفہ بن خیاط ج 1 ص 190) یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد امارت کے آخری ایام تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں (44ھ) ایک مجاہد مہلب بن ابی صفرہ نے ارض ہند کی طرف خوب جہاد کیا اور کابل اور ملتان کے درمیان قندابیل، بنّہ اور اہواز کے علاقے فتح کئے (بحوالہ تاریخ الکامل اور تاریخ ذہبی)

ڈیرہ اسماعیل خان 30ھ میں اور پشاور اور کوہاٹ 45ھ میں بعہد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فتح ہوئے۔

مجاہد اسلام حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے دن پیدا ہوئے ان کا نام خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابی سفیان سے ایسا مجاہد مانگا تھا جسے سرحد سے آگے بھیجا جائے چنانچہ انہوں نے سنان کو بھیج دیا۔ وہ بیک وقت عالم فاضل متقی اور مجاہد تھے انہوں نے ہی قلات اور کوئٹہ فتح کئے تھے جنوبی وزیرستان بنوں کوہاٹ فتح کئے تھے۔ اموی

نائب السلطنت حجاج بن یوسف کے عہد امارت میں 45ھ میں پشاور سے شمال میں جہاد کرتے ہوئے وہ شہید ہوئے۔ (اسد الغابہ) ان کا مزار تبلیغی مرکز پشاور سے دس پندرہ کلومیٹر شمال مشرق میں دریائے کابل کے کنارے پر موجود ہے۔ علاقہ کے لوگ ان کو اصحاب بابا کہتے ہیں۔ لکی مروت بھی صوبہ خیبر کا شہر ہے یہاں سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر بھی چند قبور ہیں جن کے گرد کھجور کے جھنڈ ہیں انہیں بھی لوگ اصحاب رسول ﷺ گردانتے ہیں۔

کالا باغ ضلع میانوالی دریائے سندھ کے شمالی کنارے پر ایک مکان میں دو مردوں، ایک خاتون اور ایک بچے کی قبر ہے انہیں بھی اصحاب رسول ﷺ کہا گیا ہے۔ پنجاب کے معروف ضلع جھنگ کے صدر مقام سے ٹوبہ ٹیک سنگھ جاتے ہوئے دس پندرہ میل فاصلے پر ایک علاقے کا نام صحابہ ہے۔ نام سے ظاہر ہے کہ یہاں اصحاب رسول ﷺ جہاد کے لئے آئے ہیں۔

اس سب کے بعد 92ھ مطابق 711ء میں حجاج بن یوسف ثقفی کے حکم پر محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمان خواتین اور بچوں کو دیبل کے ڈاکوؤں سے چھڑانے اور داہر کی جیلوں سے رہائی کے لئے جہاد کیا تو مذکورہ بالا علاقوں کے علاوہ کراچی سندھ، بہاولپور، شورکورٹ، چنیوٹ اور بعض روایات کے مطابق اٹک تک مجاہدینِ اسلام پہنچے۔

اس کے بعد مجاہد اسلام سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان پر اپنے سترہ مشہور حملوں میں اسلام کا پیغام پہنچایا اسی دوران ملتان میں موجود قرامطی اعدائے اسلام کا قلع قمع کیا پھر محمود غزنوی کے بعد سرزمین جہاد افغانستان ہی سے سلطان محمد غوری رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

اس نے ملتان کے قرمطیوں کا بھی صفایا کیا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا اس طرح پورے ہندوستان میں پہلی اسلامی سلطنت قائم ہوئی مگر پھر ملت فروش غداروں نے براعظم مسلم ہند پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا جسے مسلسل طویل جہادی سرگرمیوں کے بعد 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے نام سے آزاد کرا لیا گیا۔ پاکستان آج انہی علاقوں میں وجود پذیر ہے جو ابتداءً اصحابِ رسول ﷺ کی سرگرمیوں کا ثمرہ تھا اور آخر میں ابن قاسم، غزنوی اور غوری کی جہادی مساعی کا نتیجہ۔

''امن کی آشا''
تاریخ کے آئینے میں

رفیق چوھدری
almissaq@gmail.com

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جب بھی کہیں ''امن کی آشا'' کو ''چرچا'' حاصل ہوا ہے تو اس کے بعد وہاں امن کا تماشا اسی طرح لگا ہے جس طرح آج کل وطن عزیز میں یہ آشا اپنے گل کھلا رہی ہے۔ تاریخ کے صفحات سے ظاہر ہے کہ یہی اس کی ہر دور میں ''آشا'' بھی رہی ہے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان آپس کی لڑائی اور خانہ جنگی کو طول دینے کی بجائے اس وقت ہمیں اس گوشۂ تاریخ سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

امن کی آشا کو جس قدر عروج سولہویں صدی عیسوی میں حاصل ہوا اتنا کبھی نہیں ہوا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی صدی برصغیر میں مسلم اقدار کے زوال کی بھی صدی ہے۔ بلاشبہ یہ وہ وقت تھا جب ہم بلاشرکت غیرے برصغیر کے طول و عرض کے وارث تھے لیکن جب ہمارے حکمران مسلم نظریات کی پاسداری کی بجائے حرصِ اقتدار، لذتِ جاہ و جلال میں ڈوب کر محض اپنی شہنشاہیت کو دوام بخشنے کی خاطر اس آشا کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تو وہ وقت آنے میں دیر نہیں لگی جب اسی طرح سرحدوں پر انگریز بیٹھا تھا اور ہم چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر آپس میں لڑنے بھڑنے پر مجبور تھے اور ہمارے میر جعفر اور میر صادق ملک اور ملت کی بنیادیں کھود کر ''بیرونی آقاؤں'' کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔

تنزل اور بالآخر غلامی کے اس سفر کی ابتداء کا باعث ''امن کی آشا'' کا اصل چہرہ کیا

ہے؟ موجودہ دور میں اس کی صحیح ترین عکاسی دہلی میں مقیم معروف بھارتی صحافی ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک کا وہ کالم ہے جو انہوں نے پاکستان میں ن لیگ کی حالیہ حکومت کے قیام کے وقت ''نواز شریف کے لیے تاریخ بنانے کا سنہری موقع'' کے عنوان سے لکھا۔

''میری رائے میں میاں نواز شریف کی فتح پاکستان ہی نہیں پورے جنوبی ایشیاء کے لیے مبارک ثابت ہوگی۔ اگر 1999ء میں فوج ان کی حکومت کا تختہ نہ اُلٹاتی تو اب تک ہندوستان اور پاکستان باہمی رشتوں کے بہت اونچے مقام پر پہنچ چکے ہوتے۔'' (روایتی چاپلوسی اور خوشامد کے بعد گمراہی کی کھُلی دعوت) ''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ 14 برس کا بنواس (اقتدار سے دوری) کاٹنے کے بعد میاں صاحب اپنی غلطیوں کو نہیں دھرائیں گے۔ (غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد جن میں ایک یہ بھی کہ انہوں نے طالبان کو سر چڑھایا، لکھتے ہیں) ظاہر ہے اس بار وہ توازن برقرار رکھیں گے، وہ اپنا ادھورا کام پورا کریں گے (پھر بڑی طمع اور لالچ) اور کچھ ایسا کر دکھائیں گے کہ ان کا نام جناح اور نہرو سے بھی بڑا ہو جائے۔ (پھر اپنے اصل مکروہ مدعا کی طرف آتے ہوئے) میاں نواز کے والد صاحب مجھ سے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہی تھا کہ ہند، پاک فیڈریشن بن جائے اور اس دو قومی یونین ریاست کے صدر میاں نواز شریف منتخب ہوں اور پھر اراکان (برما) سے خراسان (ایران) تک ایک اکھنڈ آریانا بنایا جائے جو یورپی یونین سے بھی بہتر ہو۔ (پھر اس مکروہ آشا کو خوشنما بناتے ہوئے) ہمارے اس بڑے خواب کی شروعات ہندوستان کا کوئی لیڈر نہیں کرسکتا اسے تو پاکستان کا ہی کوئی لیڈر کرسکتا ہے کیونکہ پاکستان جنوبی ایشیاء کے بیچوں بیچ موجود ہے۔ اگر وہ اپنا راستہ کھول دے تو جنوبی ایشیا کے درجن بھر ممالک کے راستے ایک دوسرے لیے اپنے آپ کھل جائیں گے۔ (آخر میں ایک اور ابلیسی جال پھینکتے ہوئے) دیکھنا یہ ہے کہ میاں نواز شریف محض وزیراعظم کے عہدہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں یا تاریخ کی دیوار پر کوئی لمبی لکیر کھینچتے ہیں؟''۔

یہ ہے ''امن کی آشا'' کا وہ مکروہ چہرہ جس کے پیچھے ہمیشہ ایک پُرفریب اور مکروہ سوچ پوشیدہ رہی ہے اور وہ ہے ''اکھنڈ آریانا'' Myth۔ جس کے لیے امن کی آشا کو انتہائی خوشنما بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کیا ہوتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر محض ایک

مسلم حکمران کے طور پر ''مطمئن'' نہیں ہوگئے بلکہ ویدک پرتاپ جیسے خوشامدی درباریوں کی باتوں میں آکر تاریخ میں اپنا نام اونچا دیکھنے، اپنی سلطنت وحکومت کو دوام بخشنے کی خاطر بالآخر ''دین اکبری'' اور ''آئین اکبری'' کی صورت میں ایک ''لمبی لکیر کھینچ ڈالی'' اور ہندو مسلم ''باہمی رشتوں'' کو ''اونچے مقام'' تک پہنچانے کے لیے ہمارے حکمرانوں اور دانشوروں کی طرح ''امن کی آشا'' کی محض آشا ہی نہیں کی بلکہ باقاعدہ ''رشتہ داری'' کی صورت میں کئی ''آشاؤں'' کو اپنے اور کئی دوسرے مغل شہزادوں کے خلوت کدوں میں ''امن'' بکھیرنے کا موقع بھی دیا اور ہمارے حکمرانوں کی طرح ''موسٹ فیورٹ'' کا عندیہ ہی نہیں دیا بلکہ باقاعدہ طور پر ہندو تہذیب کو ''فیورٹ ہونے'' کے لیے مسلم اقدار ونظریات کی تمام تر دیواریں خود گرادیں۔ جواب میں ہندو سوسائٹی میں انہیں ''شہنشاہ اکبر'' کا لقب حاصل ہوا اور ہندو درباریوں اور آشا کے پجاریوں نے سجدہ تعظیمی بھی بجالایا مگر ــــ تاریخ کی دیوار پر یہ سب کچھ صرف لمحوں کے لیے ''لکیریں'' ثابت ہوئیں وہ بھی ایسے لمحات کے طور پر جن کی سزا صدیوں نے پائی۔ بہت جلد یہ لکیریں ہندوستان کی تاریخ میں بدنما سیاہ داغ میں بدل گئیں۔ قدرت نے اسلام سے غداری کا انتقام اس طور پر لیا کہ نہ مغل سلطنت رہی، نہ دائمی شہنشاہیت کا خواب، نہ سجدہ تعظیمی، نہ امن اور نہ آشا، کچھ بھی نہ رہا۔ مگر اسلام پھر بھی زندہ رہا اور مجدد الف ثانی کی صورت میں اللہ نے اسلام کا محافظ بھیج دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کا شوقِ نا ہنجار تھا یا ''امن کی آشا'' کا جنون جس نے مرحوم کشمیری نیشنلسٹ لیڈر شیخ عبداللہ کو انڈین کنفیڈریشن کا مکروہ منصوبہ لے کر صدر جنرل ایوب خان کے دور میں پاکستان کا دورہ کرنے پر مجبور کیا۔ مرحوم ہمارے سیاستدانوں اور آشا کے ''پروانوں'' سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر فرمایا کرتے کہ ''میرا دل ہندوستانی تہذیب میں اٹکا ہوا ہے''۔ بالآخر اس کا انجام انہوں نے اپنی زندگی میں ہی کشمیریوں کے سفاکانہ قتل عام اور اذیت ناک غلامی کی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آج وہاں بھارت دیوار برہمن تعمیر کر رہا ہے۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا تھا:

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

اگر امن کی آشا میں خیر کا کوئی پہلو موجود ہوتا اور اس کے (ڈاکٹر ویدک جیسے) ''پرچاریوں'' کے دعوؤں میں کوئی سچائی ہوتی تو مولانا ابوالکلام آزاد کو جو مقام متحدہ ہندوستان کی حمایت پر حاصل ہونا چاہیے تھا نہرو یا گاندھی کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا مگر خوشنما دعوؤں کے برعکس اقلیتی راہنماؤں کے عہدے محض ایک دکھاوا یا ڈھونگ سے زیادہ ثابت نہ ہوئے۔ بقول پروفیسر ہیری اینڈرسن اصل حقائق یہ تھے کہ جب حیدرآباد میں چالیس ہزار مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تو مولانا نے نہرو سے تحقیقات کی سفارش کی مگر اس کے باوجود رپورٹ تو سامنے نہ آسکی جبکہ اس کے بعد بھی انڈین فوج اور پولیس کی نگرانی میں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کا کھیل جاری رہا اور آج تک بستیوں کی بستیاں جلا کر مسلم ورثہ اور جائیداد واملاک پر قبضہ جمانے اور جبراً ہندو بنانے کا سلسلہ نہ صرف جاری وساری ہے بلکہ اب تو باقاعدہ مسلمانوں کا خون سیاست میں کامیابی کی ضمانت بن چکا ہے، موجودہ مودی حکومت جس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

تاریخ کی دیوار پر کھینچی گئی یہ ''لمبی لکیریں'' اس لائق تھیں کہ ہمارے ''مقتدر حلقے'' اور دانشوران سے سبق حاصل کرتے۔ جو چیخ چیخ کر بیان کر رہی ہیں کہ قومیں صرف اس وقت تک ہی زندہ رہ سکتی ہیں جب تک ان کی اصل تہذیب اور نظریات زندہ رہتے ہیں جبکہ ''امن کی آشا'' جیسے خالص دجالی ہتھکنڈے غیر ہندو قوموں کی تہذیب اور نظریات کے لیے ہمیشہ زہر قاتل ثابت ہوئے ہیں۔ تاریخ کے سینے پر نقش یہ لکیریں ظاہر کرتی ہیں کہ جس قوم نے بھی ایک بار یہ تریاق پیا ہے بحیثیت قوم اس کی تہذیب اور نظریات کی عمارت اپنی بنیادوں پر زیادہ کھڑی نہ رہ سکی اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے کھنڈرات پر ''اکھنڈ آریانا'' جیسے مکروہ محل تعمیر کرنے کے خواب سجائے گئے۔ جیسا کہ خود پروفیسر بلراج مدھوک کا 1990ء میں ہندوستان سے شائع مضمون میں اظہار ہے ''نہ یونانی رہے، نہ ہن رہے، نہ بدھ رہے اور نہ مسلمانوں کو مسلمانوں کی طرح رہنے کا حق دیا جا رہا تھا۔''

یہ تمام قومیں اپنے اپنے وقت میں ہندوستان کی تقدیر پر غالب رہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ انہیں بذریعہ جنگ زیر نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی جو ہڑ نما ''بھرت وادی'' کو گنگا اور جمنا سے باہر

کا تصور شمشیر زنی جیسے بہادرانہ جوہر کی بدولت حاصل ہوا بلکہ یہ ''امن کی آشا'' جیسے بزدلانہ اور ابلیسی حربے تھے جن کی کوکھ سے اکھنڈ آریانا کی مکروہ متھ نے جنم لیا اور اسی آشا کے پُرفریب اور خوشنما جال میں پھنس کر مذکورہ بالا اقوام اکھنڈ آریانا کی مکروہ سوچ کو پروان چڑھانے کا باعث ثابت ہوئیں۔ یہ تاریخ کا عظیم سبق ہے جسے ہمیشہ بھلا دیا جاتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب ہندو تہذیب دنیا سے تقریباً مٹ چکی تھی۔ گندھارا تہذیب کے زیر اثر بدھ مت برصغیر میں پھیل چکا تھا۔ بمطابق خود ہندو تاریخ ''ہندو دھرم کی کتابوں کو پاؤں تلے روندا جا رہا تھا اور برہمنوں کا کوئی بس نہیں چل رہا تھا'' تب ـــــ دنیا جانتی ہے کہ یہ ''امن کی آشا'' ہی تھی جس کو آخری حل کے طور پر برہمنوں نے آزمایا۔ چنانچہ گندھارا تہذیب سمیت بدھ مت کا نشان تک مٹ گیا اور نتیجہ میں دنیا سے تقریباً مٹتی ہوئی دجالی ہندو تہذیب کو دوبارہ پنپنے کا موقع مل گیا اور اس کے ساتھ ہی دنیا میں اس عظیم فتنہ (اکھنڈ Myth) نے جنم لیا جس نے آگے چل کر ان تمام قوموں اور انہی جیسی بے شمار اقوام کہ جن کا نام بھی تاریخ میں باقی نہ رہا اس ہندو آفریت کا ترنوالہ بنا ڈالا۔

اسلام کی آمد کے بعد یہ اقوام کش ہندو آسیب پژمردہ حالت میں کہیں پس پردہ چلا گیا اور جب تک برصغیر کی مسلم قومیت اپنی اصل بنیادوں پر ثابت قدم رہی اس خطہ میں مسلم نظریات و اثرات کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اس مکروہ متھ کا صفحۂ ہستی سے مکمل خاتمہ ممکن ہو چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ اس کو دوبارہ اُبھرنے کا موقع نہ دیا جاتا تو آج برصغیر کی بیشتر اقوام اپنی تاریخ، تہذیب اور پہچان کے ساتھ زندہ ہوتیں اور کشمیر، آسام، حیدرآباد، جوناگڑھ، منادر سمیت بیشتر ریاستوں میں انسانیت ہندو اجارہ داری کے زیر اثر غلامی کی طرز زندگی میں سسک سسک کر دم نہ توڑ رہی ہوتی، اقلیتوں کو زندہ نہ جلایا جاتا۔ مگر مسلم حکمرانوں کی حد سے بڑھی ہوئی حرصِ اقتدار نے سولہویں صدی عیسوی میں ایک بار پھر اس منحوس و آدم بیزار ابلیسی تصور کو ''امن کی آشا'' کی آڑ میں سر اُبھارنے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ اکھنڈ بھارت کا یہ مردہ عفریت تہذیب کی ''اکبری قبا'' اوڑھ کر نہ صرف دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا بلکہ ''آئین اکبری'' کے تحت اسے زندہ ہونے کا مضبوط جواز بھی فراہم کر دیا گیا جب قوموں کی تاریخ اور نسب بدل کر دانستہ تاریخ میں اسکی مضبوط جڑیں قائم کر دی گئیں اور ستم یہ کہ انسانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا فراڈ جو کہ

پوری انسانیت کے ساتھ سنگین مذاق سے کسی بھی صورت کم نہ تھا ''امن کی آشا'' کے نام پر کیا گیا۔ اس طرح یہ آشا برصغیر کی بیشتر اقوام کی موت کا پروانہ بن گئی اور اکھنڈ آریانا کا وہ ابلیسی منصوبہ جو اب تک محض ایک من گھڑت، بے بنیاد اور خیالی مفروضہ تھا۔ مسلمانوں کی ان سنگین غلطیوں کی بناء پر دنیا نے اس کو سچ مان لیا۔ یہاں تک کہ اسلام مخالف جذبات سے مغلوب انگریز سرکار کی پشت پناہی میں یہ دجالی عفریت پہلی بار انڈین فیڈریشن کے نام سے گول میز کانفرنسز (1930ء تا 1933ء) میں زیر بحث آچکا۔ یہ واضح طور پر ''اکھنڈ بھارت'' کے ابلیسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے مترادف تھا اور یہی وہ وقت تھا جب اقوام برصغیر کے سامنے صرف دو راستے تھے کہ یا تو وہ اس متھ کا مقابلہ کر کے اپنی تہذیب اور تاریخ کے ساتھ زندہ رہ لیں یا پھر سب کچھ ''امن کی آشا'' کی بھینٹ چڑھا کر اکھنڈ بھارت کی بنیادوں میں دفن ہو جائیں کہ جس طرح ان سے پہلی قوموں نے اپنا نشان کھو دیا۔

چنانچہ تاریخ کی یہی وہ اہم ترین پکار تھی جس پر لبیک کہتے ہوئے چوہدری رحمت علی نے گول میز کانفرنسز کے دوران ہی Now or Never کی صدا بلند کی۔

At this solemn hour in the history of India, when British and Indian delegates are laying the foundations of a Federal Constitution for that Sub-continent, we address this appeal to you, in the name of our common heritage, and on behalf of our thirty million Muslim brethren who live in Pakistan.

اور انڈین فیڈریشن کو تسلیم کرنے کے حوالے سے تاریخ کی یہ وارننگ ببانگ دہل سنائی۔

This acceptance amounts to nothing less then signing the death-warrant of Islam and of Muslims in India.

وہ پاکستان جس کی بنیادوں میں مجدّد الف ثانی کی عظیم تر قربانیاں شامل ہیں جو انہوں نے ''اکبری قبا'' میں چھپی انڈین ازم کی تہذیبی یلغار کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کو بچانے کے لیے دیں۔ علامہ اقبالؔ نے اس تشخص کو قائم رکھنے کے لیے جس کا خواب دیکھا، چوہدری رحمت علی نے بروقت انڈین فیڈریشن (اکھنڈ بھارت) کا مکروہ منصوبہ خاک میں ملاتے ہوئے جس کا نام اور نقشہ دنیا کے سامنے کے پیش کر دیا اور قائداعظم کی قیادت

میں لاکھوں مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کے بعد بالآخر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خطہ سے اکھنڈ Myth کی غاصبانہ اور مہلک سوچ کو جڑ سے اُکھاڑ کر جنوبی ایشیاء کی تمام اقوام کو اس متھ کے استحصالی شکنجہ سے نجات دلانا فطرت کو مقصود تھا۔ فطرت کا یہی تقاضا دین فطرت اسلام میں غزوہ ہند کی صورت میں بیان ہوا۔ اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ تمام انسانوں کے لیے سراپا رحمت، ممکن نہیں کہ کوئی قوم یا گروہ انسانی اس قدر شدت سے دین فطرت کا ہدف ٹھہرے البتہ یہ نظریات اور عقائد ہی ہوتے ہیں جو کسی بھی قوم کو غلط یا صحیح بناتے ہیں۔ چنانچہ یقینی طور پر غزوۂ ہند کی غیر معمولی اہمیت کی اصل وجہ یہی انڈین ازم (اکھنڈ بھارت) متھ ہوسکتی ہے جو دراصل جنوبی ایشیا میں اقوام اور انسانیت کے لیے سب سے بڑا دجالی فتنہ ہے۔ جو قوموں کی موت اور انسانیت کی قاتل ہے۔ چاہے یہ مخالف قوموں کا پانی روک کر انہیں معاشی، اقتصادی اور زرعی لحاظ سے مفلوج بنانے کی صورت میں ہو، قوموں کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی قتل عام یا ان کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر ڈاکہ ڈال کر، مختلف دجالی ہتھکنڈوں اور حیلے بہانوں سے یا جبراً ہندو بنانے کی صورت میں، اس سب کے پیچھے دراصل یہی اکھنڈ آریانا کی مکروہ سوچ کارفرما ہے۔ لہٰذا اس مہلک عقیدے کو مٹانے میں ہی دراصل خطہ میں حقیقی امن کا راز پنہاں ہے۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے اور قیام پاکستان کا قدرت کو مطلوب مقصد بھی۔ جو تاریخ کا مسلمانوں پر قرض بھی ہے اور انسانیت کے ناطے خطہ کی دیگر اقوام کی جانب سے فرض بھی، جو محض مسلمانوں کی غفلت اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے پلنے بڑھنے والے انڈین ازم کے بدمست ہاتھی کے پاؤں تلے روندی جارہی ہیں۔ چاہے یہ تاریخ کی اس اہم ترین وارننگ سے ناواقف تھیں جیسے عیسائی، سکھ، دراوڑ، اچھوت، بدھ، پارسی یا جنہیں ذرا دیر سے فطرت کی آواز پر لبیک کہنا پڑا جس طرح کشمیری، سکھ، اسامی، تامل وغیرہ سب کے لیے پاکستان ہی دراصل اُمید کی آخری کرن تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب اجتماعی نجات کے اس فطری پیغام کی تجدید کے لیے آج خطہ کی مسلم اکثریت (بنگلہ دیش، افغانستان، کشمیر) باہم متحد و منظّم قوت ہوتی۔

''اگر ہم سب مل کر اس متھ (اکھنڈ بھارت کے من گھڑت قصے) کا مقابلہ کریں اور اس کو کاری ضرب لگائیں تو اس کا خاتمہ ایسا ہوگا کہ جس کی یہ مستحق ہے اور ہم سب کے سب آزاد

ہوجائیں گے۔لیکن اگر ہم نے لیت ولعل کرتے ہوئے یہ سنہری موقع ضائع کردیا تو انڈو برٹش کا اس بارے میں دوستانہ اشتراک Entente اسے اپنے پورے تشدد کے ساتھ ہم پر دوبارہ مسلط کردے گا۔اس صورت میں ہم ہر چیز کھودیں گے اور ہم سب انڈین قوم کے غلام ہونگے۔شاید صدیوں کے لیے۔ممکن ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔(چوہدری رحمت علی 1945ء)''

آج امریکہ، برطانیہ اور دیگر اسلام دشمن قوتیں اسی قدر پورے تشدد کے ساتھ ہندو اجارہ داری کو پورے خطے پر مسلط کرنے کے درپے ہیں اور اس ضمن میں ''انڈو برٹش'' Entente کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں رہی جس کا واضح طور پر مقصد خطہ میں اسلامی نظریاتی قوتوں کو از سرنو اُبھرنے کا موقع نہ دینا صاف ظاہر ہو چکا ہے۔جبکہ ہندو اکھنڈ آریانا کے مکروہ مفروضہ کو یورپی یونین کی طرح خوشنما بنا کر کیوں پیش کررہے ہیں؟۔حقیقت آج بھی وہی ہے جو 1947ء سے قبل تھی۔

''ہندو جاتی کے افراد ـــــ ایسا اس لیے کررہے ہیں چونکہ ان کو اس متھ کے قائم و دائم رہنے سے موقع ملتا ہے: اول، یہ کہ ہمیں وہ اپنے اندر گھلا ملا کر رکھیں، اس کے بعد یہ کہ وہ ہمیں قوموں میں تتر بتر کردیں، اور آخر میں یہ کہ وہ ہمیں اپنی انڈین (ہندی) قومیّت میں جذب کرلیں''۔(چوہدری رحمت علی۔15 مئی 1945ء)

سولہویں صدی عیسوی میں ہم ''گھلنے ملنے'' کے جس تلخ تجربہ سے گزر کر کے اپنی اقدار اور میراث کھو چکے اور اپنی ان نادانیوں کے باوصف اکھنڈ بھارت کے گڑھے مُردے کو اُکھاڑ بیٹھے کہ جس نے اپنی دجالی تہذیب کی قبر سے سر نکالتے ہی ایک ناسور کی شکل اختیار کر کے پورے خطے کی آزادی کو سلب کرلیا۔آج ایک بار پھر ہم اسی تلخ تجربہ کو ''امن کی آشا'' کے نام پر دوہرا رہے ہیں۔موسٹ فیورٹ کا عندیہ پیش کر کے اکھنڈ بھارتی متھ کو مزید پروان چڑھا رہے ہیں۔دجالی تہذیب اور کلچر کو مسلط کر کے مسلم تشخص، تہذیب و روایات کو مسخ کیا جارہا ہے۔ایک طرف مفاد پرست عناصر اور دین بیزار سیکولر طبقہ انڈیا سے دوستی اور تجارت کی پینگیں بڑھانے کے لیے بیتاب ہے اور دوسری طرف ہمارے ارباب اختیار، سیاست دان اور دانشور دو بالکل مختلف اور متضاد تہذیبوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک صرف سرحد ہی فرق ہے۔

بحیثیت مسلم اپنے اعلیٰ ترین نصب العین اور عظیم ترین مقصد جس کے لیے فطرت نے

ہمارا انتخاب کیا تھا کو پس پشت ڈالتے ہوئے امن کی آشا'' کی ان بھول بھلیوں میں بھٹکنے کا منطقی نتیجہ بھی لازمی طور پر وہی نکلنا تھا جو سولہویں صدی عیسوی کے بعد ہم بھگت چکے ہیں یعنی ایک اُمتِ واحدہ کا ہمہ گیر تصور رکھنے کے باوجود ایک بار پھر مختلف ،نسلی، لسانی، علاقائی گروہوں، فرقوں اور قبائل میں ''تتر بتر'' ہو کر آپس میں لڑنے بھڑنے پر مجبور ہیں۔ انگریز دوبارہ سرحدوں پر بیٹھا ہماری نظریاتی اور اساسی قوت کو کچلنے کے درپے ہے اور دوسری طرف ویدک پرتاپ جیسے ہندو متعصب ذہن ہماری ان نادانیوں کی بناء پر ''اراکان (برما) سے خراسان (ایران) تک اکھنڈ آریانا'' کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

تاریخ کی یہ سخت ترین وارننگ متقاضی ہے کہ ہم آج بھی اپنے اولین نصب العین کی طرف لوٹ آئیں اور بحیثیت مسلمان اس عظیم تر مقصد کو پہچان لیں جو خطہ میں ہماری علاقائی اور ملی ذمہ داریوں کا امین بھی ہے تو دور نہیں کہ قدرت ہمیں ایک بار پھر بحیثیت پاکستانی، افغانی، بنگلا دیشی، کشمیری، سنی، دیوبندی، وہابی متحد و منظّم کر دے اور ہم ایک بار پھر مسلمہ قوت بن کر خطہ کی دیگر اقوام کے لیے بھی نجات دہندہ بن جائیں۔ جلد یا بدیر مسلم اتحاد پر مشتمل کنفیڈریشن ہی خطہ میں طاقت کے توازن، مسائل کے حل اور حقیقی امن کے قیام کا فطری حل ہے۔ بصورت دیگر اگر ہم نے آج بھی اپنی ملی، علاقائی اور فطری ذمہ داریوں کا احساس نہیں کیا تو شاید تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے اور فطرت اپنا بدترین انتقام اس طور پر لے کہ سولہویں صدی کے بعد اتنا نقصان نہ ہوا ہو جتنا ہماری قوت کا شیرازہ بکھرنے سے اب ہو سکتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ
تُحِبُّ الْعَفْوَ
فَاعْفُ عَنَّا

(اے اللہ بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے، تو معافی کو پسند فرماتا ہے پس تو ہمیں معاف فرما دے)

تعلیم اور قومی شعور

پروفیسر سیّد محمد سلیم

(بشکریہ ماہنامہ ''تعمیرافکار'' کراچی۔فروری، مارچ2014ء)

انسان کی طبعی خواہش تسلسل حیات اور افزائش نسل ہے۔اس کی وجہ سے انسان شادی کرتا ہے، گھر آباد کرتا ہے اور اولاد کی پرورش کرتا ہے۔اسی طرح انسان کی ایک طبعی خواہش یہ بھی ہے کہ اس کے معنوی وجود کا تسلسل بھی جاری رہے۔دنیا کی زندگی میں جو کچھ اس کے حاصلات ہیں، معلومات ہیں اور تجربات ہیں وہ بھی جاری وساری رہیں، وہ بھی باقی رہیں۔اس کی اولاد جہاں اس کے مادّی وجود کے تسلسل کی ضامن ہو، وہاں اس کے معنوی افکار وتصورات کی بھی وارث ہو۔نئی نسلیں بزرگوں کے علمی اندوختے اور فکری ورثے کی محافظ ہوں۔اس کو فروغ دیں، اس میں اضافہ کریں۔انسان کی اس خواہش کی عملی شکل کا نام عملِ تعلیم ہے۔

جب سے انسان زمین پر موجود ہے اس وقت سے انسانی خاندان کا بھی وجود ہے، اس وقت سے انسانی معاشرے کا بھی وجود ہے۔تعلیم معاشرتی سرگرمی کا ایک لازمی جز ہے۔اس وقت سے تعلیم کے عمل کا بھی پتہ چلتا ہے، خواہ وہ تعلیم کیسی ہی غیر مرتب، غیر مدوّن اور ابتدائی شکل میں ہو، بہرحال تعلیم اوّل روز سے جاری ہے۔

انسان کا ابتدائی معاشرہ جدا جدا خاندانوں اور قبیلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔وہاں خاندان کا سربراہ یا قبیلے کا سردار معاشرتی رموز کا ذمے دار ہوتا تھا۔فارغ اوقات میں خاندان کا سربراہ یا قبیلے کا سردار نوخیز نسلوں کو تعلیم دیتا تھا۔اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ عام طور پر شام کے وقت کم عمر بچے

اور نوجوان لڑکے سردار کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہ ان کو اپنی زندگی کے واقعات اور حادثات سناتا تھا۔ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کی تفصیل بیان کرتا تھا۔ دوسرے قبیلوں سے لڑائی جھگڑے کی داستانیں سناتا تھا۔ کہانیاں، پہیلیاں، اشعار، تک بندی، مذاق، دوادارو، جادوٹونا، بھوت پریت سب کچھ بیان کرتا تھا۔ اپنے حاصلات و تجربات بیان کرتا تھا۔ یہ ایک غیر رسمی مدرسہ تھا، اس کا یہ غیر رسمی نصابِ تعلیم تھا۔ اس تعلیم کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا۔ سنانے والا تبدیل ہو جاتا تھا، سننے والے تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ مگر چوپال باقی رہتی تھی، مدرسہ جاری رہتا تھا، نئی نسلوں کے اذہان کی آب یاری ہوتی رہتی تھی۔

گھر کے اندر بھی ایک مدرسہ جاری رہتا تھا جس کو کوئی بڑھیا دادی یا نانی چلاتی رہتی تھی۔ شام کو بچے اور بچیاں نانی اماں کے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ یہ بچوں کی خانگی درس گاہ تھی۔ بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ نانی اماں اس شوق کی تکمیل کرتی تھیں اور ان کہانیوں کے اندر کوئی نہ کوئی سبق آموز بات بچوں کے دلوں میں بٹھا دیتی تھیں۔

ابتدائی زمانے کے اس مدرسے کو اور اس کے نصابِ تعلیم کو آج کتنا ہی بھونڈا اور بھدا خیال کیا جائے مگر وہ پوری تعلیم تھی، یعنی معلومات متعلق انسان، معلومات متعلق اشیاء اور قبائلی شعور، آج بھی تعلیم کے یہی تین اجزاء ہیں۔ علومِ انسانی، علومِ مادی اور شعورِ قومی انسان منفرد زندگی بسر نہیں کرتا۔ یہ انسانی زندگی کسی نہ کسی معاشرے کا فرد بن کر کسی نہ کسی قبیلے کے ذریعے ہوتی ہے۔ قبیلہ اس کی ذات کا جز ہوتا ہے۔ تعلیم صرف معلومات فراہم کر دینے کا نام نہیں بلکہ افراد کو مربوط اور منظّم وحدت میں تبدیل کر دینے کا نام ہے۔ قبیلے اور قوم کا شعور پیدا کر دینے کا نام ہے۔ اس سارے عمل کو تعلیم کہتے ہیں۔

علوم وفنون میں ترقی

بعد کے ادوار میں انسانی معاشرے نے ہر جہت سے ترقی کی۔ بعد کی صدیوں میں تہذیب وتمدن نے خوب خوب ترقی کی۔ معاشرے کے اندر موجود اداروں نے ترقی کی، شعبۂ تعلیم نے ترقی کی۔ انسان نے مختلف علوم وفنون کا انکشاف کیا۔ ان علوم کے اندر بیش بہا تفصیلات جمع کی گئیں۔ علوم شاخ در شاخ پھیل کر وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ صفحۂ ارضی پر نمودار

ہونے والی ماضی کی اقوام نے اپنے اپنے دور میں علوم وفنون کی آب یاری کی، ان میں اضافہ کیا۔ آج وہ اقوام تو فنا ہوگئیں مگر ان کا علمی ورثہ محفوظ ہے۔ بابل (عراق)، مصر، یونان، روم، ایران و ہند، پھر عربوں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے دور میں علوم وفنون میں خوب خوب اضافے کئے۔ آج مغربی اقوام کی سرکردگی میں علم کا قافلہ رواں دواں ہے، پیش قدم کر رہا ہے۔ آج کے انسان کے پاس جو ذخیرہ علم جمع ہو گیا ہے وہ تنہا کسی ایک قوم کی محنت نہیں، صدیوں کا اندوختہ ہے، وہ مختلف اقوام کا ورثہ ہے۔

قومی شعور

دوسرے علوم کی ترقی کے ساتھ قومی شعور کی تعلیم کو بھی اہمیت ملی۔ اس کی تعلیم وتلقین کے طریقوں میں ترقی ہوئی۔ نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کے بعد یورپ میں افراد کو باہم مربوط رکھنے والے مذہب کا رشتہ کمزور پڑ گیا، مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس خلا کو قومی شعور کی تعلیم نے خاص طور پر پُر کیا۔ قوم کو جوڑے رکھنے میں، افراد کو متحد رکھنے میں، قومی شعور نے اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں اس کی اہمیت کو خاص طور پر محسوس کیا گیا۔

اس دور میں قومی شعور کی آب یاری خاص طور کی جانے لگی۔ قومی ادبیات اور قومی تاریخ کی تعلیم کے ذریعے قومی شعور کو بیدار کرنے، پروان چڑھانے اور مستحکم کرنے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ اس کو نصابِ تعلیم کا اہم حصہ بنایا گیا۔ یورپ کا ہر ملک جدا تھا۔ اس کا ادب جدا تھا، اس کی تاریخ جدا تھی، صرف اپنے ملک کی تاریخ اور اپنے ملک کا ادب پڑھا کر نوخیز نسلوں کے اندر قومی شعور کو بیدار کیا جاتا تھا اور مضبوط کیا جاتا تھا۔ انگریز ملٹن کی شاعری اور شیکسپیئر کے ڈراموں کو دنیا جہاں کے ادیبوں پر فوقیت دیتے ہیں۔ عہد وکٹوریہ کے ڈرامہ نویسوں کو پڑھائے بغیر وہ سمجھتے ہیں کہ قومی شعور کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ان ڈراموں کے ذریعے سے نوخیز اذہان کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہی حال دوسری اقوام کا ہے۔ جرمن گوئٹے کی شاعری کو سب سے افضل قرار دیتے ہیں اور صرف جرمن ادب کی تعلیم دیتے ہیں۔ اہل فرانس وکٹر ہیوگیو کو سب سے افضل سمجھتے ہیں اور فرانسیسی ادب کی تعلیم اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔ کوئی ملک دوسرے ملک میں اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لئے نہیں بھیجتا۔ کبھی نہیں سنا کہ جرمنی نے فرنک فرٹ کے بجائے اپنے بچوں کو پیرس یا

ماسکو بھیجا ہو۔اسی طرح کبھی اہل فرانس نے اپنے طلبہ کو آکسفورڈ یا کیمبرج نہیں بھیجا۔اس لئے کہ طلبہ میں قومی شعور کی آب یاری قومی درس گاہ میں ہوسکتی ہے۔انگریز ہندوستان میں حکمران رہے۔ سینکڑوں درس گاہیں کھولیں۔ان میں سے بعض کے تمام اساتذہ انگریز ہوتے تھے،مگر پھر بھی وہ اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجتے تھے۔وہ کہتے تھے ہندوستانی ماحول میں بچوں کی صحیح ذہنیت تشکیل نہیں پائے گی۔

قومی شعور نے افراد قوم کو مربوط اور متحد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔فرنگی اقوام صدیوں تک ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں حکومت کرتی رہی ہیں۔ ہزاروں میل دور سے مرکزی حکومت ان مقبوضات کو کنٹرول کرتی رہی۔اس کے احکام یہاں بلاچون وچرا نافذ العمل رہے۔کبھی نہیں ہوا کہ کسی وائسرائے نے نافرمانی کی ہو۔ہر یورپین قومی مفاد پر اور ذاتی انا پر ترجیح دیتا تھا۔

جذبے کی نشوونما:

کوئی بھی انسانی جذبہ ہو،اگر وہ مردہ نہیں ہو چکا،تو ضرور اظہار چاہتا ہے،ضرور نشوونما چاہتا ہے،آب یاری چاہتا ہے۔وہ کسی حال میں دبا رہنا اور پوشیدہ رہنا گوارا نہیں کرتا۔قومی شعور برملا اپنی انفرادیت کا اظہار چاہتا ہے۔علوم میں،ادب میں،فنونِ لطیفہ میں،فن تعمیر میں،غرض یہ کہ ہر میدان میں قومی شعور اپنی انفرادیت اور اپنے تشخص کا نقش جمانا چاہتا ہے۔اسی وجہ سے مختلف قوموں کے ادب میں فنونِ لطیفہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

قومی شعور اپنا اظہار ہر میدان میں کرتا ہے،وضع قطع میں،لباس اور پیراہن میں۔ انگریز صدیوں تک ہندوستان میں رہا۔انگریزی لباس سرد ملک کے لئے موزوں ہے، ہندوستان جیسے گرم ملک کے لئے وہ ناموزوں ہے،مگر انگریز نے اپنا لباس ترک نہیں کیا،اپنی انفرادیت ترک نہیں کی۔آج کل امریکہ کا غلبہ ہے۔درحقیقت امریکی قوم انگریزی نسل کا ہی حصہ ہے مگر وہ اپنی انفرادیت چاہتا ہے۔انگریزی لباس،پینٹ،ٹائی،ویسٹ کوٹ،نیکر وغیرہ کو اس نے ترک کردیا ہے اور بوشرٹ سے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا۔روس بھی دراصل مغربی یورپی تہذیب کا ہی حصہ ہے۔مگر اسٹالن نے ٹائی اڑادی اور بند گلے کا کوٹ رائج کیا۔ماوزے تنگ بھی سوشلسٹ ہے مگر اس نے کاٹ مختلف کرکے اپنا کوٹ منفرد کرلیا۔قومی شعور انفرادیت

چاہتا ہے اور انفرادیت اظہار چاہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لباس صرف جسم ڈھانکنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ قومی تہذیب کے تسلسل کا اعلان ہے بلکہ قوم کو معنویت کے تسلسل کا اعلان ہے۔ جب ایک عرب لڑکا لمبا کرتا، کندورہ ثوب زیب تن کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس عظیم قوم کا ایک فرد ہے جو صفحۂ ارض پر صدیوں سے موجود ہے، جس کے کارنامے صفحاتِ تاریخ پر مرقوم ہیں وہ جو اُندلس کی تہذیب کا فرد سمجھتا ہے، وہ خود کو ابوتمام اور متنبّی کا وارث سمجھتا ہے، وہ ان کے اشعار پڑھتا ہے، ان سے ہم کلام ہوتا ہے، اس طرح اس کے اندر ایک عجیب طرح کا افتخار اور اعزاز پیدا ہوتا ہے، وہ قدم عزو وقار کا تسلسل سمجھتا ہے۔ جب ایک ایرانی لڑکا شاہنامہ پڑھتا ہے، فردوسی سے، سعدی سے، حافظ سے ہم کلام ہوتا ہے، اس وقت وہ احساس فکر ومباہات سے سرشار ہو جاتا ہے، اس وقت وہ قومی شعور کی بلندی پر ہوتا ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

کیا یہ کیفیت اور یہ سرور ان طلبہ میں پیدا ہوسکتا ہے جو اجنبیوں کا لباس پہنتے ہیں اور اجنبی بولی بولتے ہیں؟ کیا قومی شعور ان کے اندر قومی سرشاری کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔

قومی شعور اور انگریزی تعلیم

ہزار سال تک دنیا کے وسیع وعریض خطوں پر قیادت، سیادت اور رہنمائی کرنے کے بعد مسلمان قوم پر زوال طاری ہوگیا۔ قوم بے عملی کا شکار ہوگئی۔ علوم وفنون جمود کا شکار ہوگئے۔ ہندوستان میں آٹھ سو سال تک حکمرانی کرنے کے بعد مسلمانوں کی حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریز ہندوستان کے حکمران بن گئے۔

انگریزوں نے یہاں اپنے نظامِ تعلیم رائج کیا، گزشتہ دو صدیوں میں اہل یورپ نے علوم کے میدان میں جو انکشافات، اختراعات اور تحصیلات کی تھیں، ان سے اہل ہند کو واقف کرایا علمی میدان میں دنیا کی علمی سرگرمیوں سے رشتہ بحال کیا۔ علمی تسلسل میں جو انقطاع واقع ہو چکا تھا اس کو بحال کیا، جوڑا، جمود کو ختم کیا، علمی سرگرمیوں کو بحال کیا۔ ہندوستان پھر سے کاروانِ علم وترقی میں شامل ہوگیا۔ انگریزی دور کی تعلیم کا یہ عظیم احسان ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔

تعلیم کے باب میں انگریز نے ہندوؤں کے ساتھ ایک پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں

کے ساتھ دوسری پالیسی اختیار کی۔ دونوں قوموں سے یکساں رویہ اختیار نہیں کیا۔ ہندوؤں کو جدید مغربی علوم کی تعلیم دینے میں ان کی مخصوص ذہنیت کا لحاظ رکھا۔ ہر طرح کی کوشش کی کہ ان کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ ان کے رسم ورواج کو برقرار رکھا، ان کے لباس کو برقرار رکھا، تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مانوس ہوں اور جدید علوم کی تحصیل کریں۔

مسلمانوں کے معاملے میں انگریزی پالیسی کے تین دور ہیں۔ واضح رہے کہ مسلمان اس وقت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ، روشن دماغ اور پیش قدمی کرنے والی قوم تھی۔ عام پروپیگنڈے کے برخلاف مغربی زبانیں اور جدید علوم سیکھنے کا ان کو بہت شوق تھا۔ انگریز جب آئے بھی نہیں تھے، پرتگالیوں کے دور سے وہ مغربی زبانیں سیکھ رہے تھے۔ مولوی عبدالقادر بن خیر اللہ جون پوری (۱۱۴۰ھ۔۱۲۰۷ھ/ ۱۷۲۸ء۔۱۷۸۳ء) مغربی افکار ونظریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے فرانسس بیکن کے افکار پر تنقید کی تھی۔ ان کی کتاب کا نام ہے: التعقّب علی باکون المغربی۔ مغربی افکار پر تنقید کے حوالے سے ان کی دوسری کتاب تھی: المحاکمۃ بین العلوم المشرقیہ والمغربیہ۔ علامہ تفضّل حسین کاشمیری لکھنوی (۱۷۱۵ء/ ۱۸۰۱ء) نے نیوٹن کی کتاب PRINCIPIA کا براہِ راست لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایسے بھی مسلمان تھے جو انگریزی زبان میں صاحب تصنیف تھے۔ حکیم اطہر علی دہلوی نے فیل پا (ELEPHAN TIASIS) پر انگریزی زبان میں مقالہ لکھا تھا۔ لطف اللہ سورتی نے اپنی خودنوشت انگریزی زبان میں لکھی تھی: AN AUTO BIOGRAPHY OF LUTFULLAH۔ مولوی شہامت علی خان نے تقویت الایمان کے ایک باب کا ترجمہ THE SUPPORT OF FAITH کے نام سے کیا تھا، جولندن سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تمام لوگ ۱۸۵۷ء سے قبل گزرے ہیں۔

اس علمی ذوق وشوق کے باوجود انگریزی حکومت نے اوّل دن سے یہ طے کیا کہ مسلمانوں کو ناخواندہ بنایا جائے، ان کو پیچھے دھکیلا جائے۔ ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۸ء میں قوانین یافت (ACTS FOR THE RESUMPTION OF LAND) کے ذریعے پورے ملک میں پھیلے ہوئے اوقاف ضبط کر لئے گئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا ہزار سالہ نظامِ تعلیم اوقاف

کے ذرائع سے چل رہا تھا۔ یہ نظام سوتے خشک ہو جانے سے ٹھٹھر کر ختم ہو گیا۔ ولیم ہنٹر کو بھی اعتراف ہے کہ قوانین بازیافت کا اجرا مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے لئے شاہ ضرب (MASTER SHOCK) ثابت ہوا۔ نظاماتِ تعلیم کو ایک ایک سال میں سات سات سو مدارس کے ختم ہو جانے کی اطلاع ملتی تھی۔ اس طرح قدیم نظامِ تعلیم ختم کر کے ان کو جاہل اور ناخواندہ بنا دیا گیا۔

جدید انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے مسلمان شوقین تھے جس کا اظہار اُوپر کے بیان سے بخوبی واضح ہے۔ اوّل تو وہاں داخلہ نہیں دیا گیا، دوسرے پراپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمان علما نے انگریزی تعلیم کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کو ایک صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر آج تک کسی نے وہ فتویٰ پیش نہیں کیا جو انگریزی کے خلاف دیا گیا تھا۔

دوسرا مرحلہ وہ تھا جب لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں عربی فارسی کی تعلیم کو سارے ملک میں ختم کر دیا۔ ہزار سالہ نظامِ تعلیم کی بساط اُلٹ دی۔ ہزار سال سے مسلمانوں کے علون و فنون عربی فارسی زبانوں میں محفوظ چلے آ رہے تھے۔ عربی فارسی سے بے گانہ بنانا اسلامی علوم سے بے گانہ بنانا تھا۔ مذہب سے، قومی تاریخ سے، ملّی شعور سے بے گانہ بنانے کے مترادف تھا۔ جہالت کے سمندر میں غرق کر دینے کی ایک مذموم کوشش تھی۔ اللہ کریم جزائے خیر دے اس وقت کے علمائے کرام کو، جنہوں نے خطرے کی سنگینی کو محسوس کر لیا اور اُردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال اور باثروت بنا دینے کے لئے کمر ہمت کس لی، جو اس وقت تک ایک بچگانہ زبان تھی۔ اُنہوں نے اس علوم کا خزانہ بھر دیا۔ آج وہ ہر اعتبار سے عربی فارسی کا نعم البدل ہے۔ ایک صدی کی مختصر مدت میں کسی عالمی زبان نے اس سرعت سے ترقی نہیں کی ہوگی جتنی اُردو زبان نے کی ہے۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جب نصف صدی تک مسلمانوں پر ہر طرف سے علم کی راہیں محدود کر دینے کے بعد پس ماندہ اور جاہل بنا دینے کے بعد بڑی احتیاط سے جدید تعلیم کا دروازہ کھولا گیا۔ علی گڑھ میں انگریزی کالج قائم کیا گیا جہاں سے جدید تعلیم یافتہ افراد پیدا ہونے لگے۔

تعلیم کے ذریعے سے قومی شعور کی آب یاری کرنے کے معاملے میں انگریزوں نے ہندوؤں پر بے حد فیاضی سے کام لیا۔ ہندوؤں میں قومی وحدت کا کوئی تصور نہیں تھا، نہ کوئی قومی

تاریخ تھی، انگریزوں نے ان کو تاریخ مرتب کر کے دی۔ سیاحوں کے بیانات، کتبے، سکے، کھنڈرات کی معلومات کو جوڑ جوڑ کر ہندوؤں کی تاریخ مرتب کی۔ سنسکرت کی مفقود کتابوں کو تلاش کیا اور صاف ستھرا بنا کر شائع کیا۔ ہندی زبان کی فورٹ ولیم میں تشکیل نو کی گئی۔ مختلف انداز سے ہندوؤں کی خدمت کر کے ان کو ایک قوم بنایا۔ ان کو ایک وحدت میں منسلک کیا، ان کے اندر قومی شعور کی آب یاری کی۔ انگریز نے ان کو مغربی لباس پہنا کر ان کے اُبھرتے ہوئے قومی شعور کو مجروح نہیں کیا بلکہ قدیم ہندووانہ لباس کے ساتھ ساتھ ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ راجہ رام موہن رائے، رابندر ناتھ ٹیگور، رانا ڈے، گھوکھلے، نہرو، گاندھی کی تصویریں دیکھ لیجئے۔ سب اپنے لباس میں ہیں، سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، کسی نے بھی اپنا قومی لباس ترک نہیں کیا۔ لباس کے ذریعے سے وہ اپنی قوم سے بدستور جڑے رہے۔ ان کے اندر یہ خیال راسخ ہو گیا کہ ہم ایک عظیم قوم ہیں، اپنے قدیم لباس کے ساتھ ہم جدید علوم کی تحصیل کر سکتے ہیں۔ انگریز نے ہندوؤں کی تعلیم صحیح خطوط پر کی، قومی شعور کو مجروح نہیں کیا۔ اس کی آب یاری کی، قومی وحدت کو تقویت دی۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں نے دوسرا رویہ اختیار کیا۔ ان کے قومی شعور کو دبایا گیا، پست کیا گیا، اس کا اظہار کرنے اور اُبھرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ راجہ رام موہن رائے کے قائم کردہ کالج کا نام ودیالیہ رکھا گیا (۱۸۷۷ء)۔ اور سرسیّد احمد خان کے کالج کا نام اینگلو محمڈن اونیٹل کالج رکھا گیا (۱۸۷۷ء) حالانکہ مسلمان محمڈن کے نام سے نفرت کرتے ہیں۔ سینکڑوں ہندو کالج قائم ہوئے، کسی کا امتیازی نشان تاج برطانیہ نہیں ہے، مگر علی گڑھ کے امتیازی نشان میں چاند، ستارے اور کھجور کے ساتھ تاجِ برطانیہ بھی شامل ہے، تاکہ برطانیہ کی وفاداری بھی لازمی ہو۔

عمارت میں جگہ جگہ انگریزوں کے نام اور مقولے کندہ کیے گئے۔ کسی ہندو کالج میں ایسا نہیں ہے۔ کالج کا آغاز ملکہ وکٹوریہ کے جشن تاج پوشی کے دن ہوا۔ وائسرائے ہندوستان لارڈلٹن کے مبارک ہاتھوں سے سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کسی ہندو کالج کے ساتھ ایسا عمل نہیں ہوا۔ علی گڑھ میں انگریز بہادر کی عنایات پر عنایات تھیں۔ انگریزی لباس پہننا اس کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے لازمی تھا۔ خود بابائے کالج سرسیّد احمد خان نے کوٹ اور پیکا لباس اختیار کر لیا تھا۔

ان اقدامات کے غیر شعوری اثرات مسلمان طلبہ پر یہ پڑے کہ اگر جدید علوم حاصل کرنے ہیں، انگریزی زبان پڑھنی ہے تو پھر اپنا قومی لباس ترک کرنا ہوگا اور اس کی جگہ انگریزی لباس زیب تن کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ تعلیم یافتہ اشخاص کا لباس انگریزی ہے۔ یہاں سے یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ جو لوگ قومی لباس پہنتے ہیں وہ جاہل ہیں، تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور ایک طرح کی نفرت ان کے خلاف دلوں میں بیٹھ گئی۔ تعلیم یافتہ افراد اس طرح اپنی قوم سے کٹ گئے۔ اس وقت سے مسلمانوں میں مسٹر اور ملا کی تفریق پیدا ہوئی ہے۔ دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ قومی وحدت منقسم ہوگئی۔

لباس ترک کرنے کے بعد جدید طبقہ اپنی تہذیب سے کٹ گیا، اپنے ماضی سے کٹ گیا، کیا وہ خود کو شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالحق دہلوی کا وارث کہہ سکتا ہے؟ کیا وہ خود عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی کا وارث کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے اندر قومی شعور سے پیدا شدہ افتخار و اعزاز کی سرشاری کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے؟

جن لوگوں نے انگریزی دور کی تعلیمی پالیسوں کا دِقت نظر سے مطالعہ نہیں کیا ہے، جن کا مطالعہ سرسری ہے وہ انگریز کے دوہرے رویے کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کے اثرات ہندوؤں پر ایک طرح اور مسلمانوں پر دوسری طرح کیوں ہوئے؟ ع سخن شناس نہ ای دلبرا! خطا ایں جا است

ڈی این اے

مادّی نظریات کو مسترد کرنے والی حیرت انگیز معلومات

انجم اقبال

(بشکریہ ماہنامہ ''بیداری'' حیدرآباد، جون 2014ء)

ڈی این اے (DNA) کی معلومات تک پہنچنا سائنس کی تاریخ کا بڑا اہم سنگ میل ہے۔ مادے پر مبنی کائنات کی تعبیر جو جدید دور کا بڑا اہم حصہ بن گئی تھی، اب جدید دور کے بعد، مابعد الجدید یا POST MODERN دور میں خود سائنس کے ذریعے سے اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے انجامِ کار وہ سائنس، جو خدا کی منکر ہوگئی تھی، اب خدا کا اقرار کیا چاہتی ہے۔ دنیائے سائنس نے مان لیا ہے کہ چارلس ڈارون کے تصورِ ارتقاء نے انسانیت کے 150 سال خراب کئے ہیں۔ اس تصور کے تحت بے جان ایٹموں (ATOMS) نے کسی مبہم طریقے سے اپنے آپ کو اِس طرح استوار کرلیا کہ وقت گزرتے، یہ ایٹم زندگی کی متعدد قسموں کو اختیار کرتے گئے اور جان دار شکلیں دھارتے گئے اور آخرکار بندر کی شکل سے گزرتے ہوئے انسان کے وجود کا باعث ہوگئے۔ قدیم ترین تہذیبوں، یونان میں سقراط سے پہلے اور مصر اور بابی لون میں بھی انسانوں کی زندگی کی تغیر پذیر تو ہم پرستانہ منزلوں (STAGES) میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ڈی این اے کی تفصیل بتائی جائے کہ اس دریافت نے کس طرح خدا کے قریب ہونے کا راستہ ہموار کیا ہے، ہم یہ بتاتے چلیں کہ 19 ویں صدی میں تین بڑی طاقتور آوازیں گونجتی رہی ہیں جس میں سے ہر آواز کے لاکھوں پیروکار پیدا ہوئے۔ اِن میں ایک آواز

کارل مارکس کی تھی جس نے تمام دنیا کے محنت کشوں اور کاری گروں کو یکجہتی کا پیغام دیا۔ اِس کے تصورات اتنے جامع قرار پائے کہ تاریخ، معاشیات و مالیات، سیاست اور معاشرے کے مکمل احاطے کے ساتھ علم ودانش کے بے اندازہ شقوں کو متاثر کر گئے۔ یہ انقلاب برپا کرنے اور اپنی دنیا آپ تبدیل کرنے والے خیالات تھے جو اپنی ابتدائی شکل میں 1848/84ء میں اشتراکی منشور (COMMUNIST MANIFESTO) کی شکل میں سامنے آئے۔ یہ مادہ پرست پس منظر میں صرف دولت کی تقسیم پر سماج کی تعمیر کا وہ خواب تھا جس کی تعبیر روس میں بڑے پیمانے پر آزمائی گئی۔ روئے زمین پر اس تصور کے کروڑوں پیروکار پیدا ہوئے اور اِس کی ہم نوائی میں زندگی کی تعبیر پھر سے کی جانے لگی۔ خدا ناشناس علمی عنوانات، روشن خیالی، عورتوں کے حقوق جیسے سینکڑوں خوبصورت الفاظ تراشے گئے۔ جو عام آدمی کو خوش کرنے اور ایک معیاری انصاف پسند دنیا بنانے کا ولولہ انگیز طوفان تھا جو بڑے بڑوں کو بہالے گیا۔ روس کے خاتمے کے ساتھ یہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے تمام ہم نوا اور پیروکار اپنے اپنے ملبوس میں واپس جانے کے راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

دوسری آواز فرائڈ کی تھی جو 1882ء میں شعور اور تحت الشعور کی بحث کے ساتھ اُبھری اُس نے تجربات سے ثابت کیا کہ بھولی ہوئی یادیں اور تجربات تحت الشعور میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور اُن کو واپس یاد دلایا جا سکتا ہے۔ ان تجربات کو کرنے کے لئے اس نے نفسیاتی تجزیے (PSYCHOANALYSIS) کا وہ تجرباتی طریقہ پیش کیا کہ رومانی دنیا کے انسانی ذہن کے لئے لامحدود وسعتوں تک ترقی کر سکنے کے امکانات وا کر دیے۔ یورپ، امریکہ اور دنیا بھر میں نفسیاتی تجزیے کی تجربہ گاہیں کھل گئیں۔ فرائڈ کی سب سے زیادہ مشہور تشریح اُس کا لبیڈو (LIBIDO) نظریہ تھا، جس کے لاتعداد ہم نو اور بے اندازہ مخالفین بھی سارے عالم میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لبیڈو نظریے کے تحت انسان اپنی تمام نشوونما میں پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ مانگنے کے وقت سے موت کی آخری ہچکی تک ایک جنسی تسکین کا متمنی رہتا ہے۔ جنسی لذت کی کمی اور زیادتی کے تجربات کے تحت ہی انسان کی تمام جسمانی، ذہنی، دماغی، عملی اور دانش مندی کی

کارفرمائیاں وجود پاتی ہیں۔ اس نظریے کو انسان کے تمام اوامر زندگی پر محیط کرنے کی کوشش عالمی پیمانے پر کی گئی۔ یہ خود پسندی (NARCISSISM) تھی، یعنی وہ نفسی کیفیت، جس میں انسان اپنی ہی ذات کو کامل اور خود اپنے ہی عشقِ ذات میں محو رہنا کافی سمجھتا ہے۔ اپنی جسمانی لذتوں کے پانے میں گم ہوجانے اور اس کو مرکز حیات اور مقصد کائنات سمجھانے والوں کی ایسی شدید گونج تھی مختلف ناموں سے 19 ویں صدی میں گونجتی رہی اور 21 ویں صدی کے آتے ہی غلط اور بے بنیاد ثابت کردی گئی۔

تیسری آواز ڈارون کی تھی جس نے انسان کو بندر کا رشتے دار بتایا اور فلسفۂ ارتقا کے دیوانے گھر گھر نظر آنے لگے۔

2000ء میں یہ ثابت ہوا کہ جب روشنی کی رفتار کو کئی گنا بڑھایا گیا تو سائنس دان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اِس تجربے کے دوران میں تاثیر (EFFECT) اُس کے سبب (CAUSE) سے پہلے ہوئی۔ ایک اخبار نے لکھا کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ کسی سبب سے پہلے اُس کی تاثیر کا ہونا ممکن ہے۔ اب تک خیال تھا کہ کسی بھی اثر، انجام، نتیجہ یا حاصل کو پانا اُس کے سبب، وجہ علت کے ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ کسی واقعہ کی انتہا اُس کی ابتداء سے پہلے بھی ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ واقعہ خود اپنے آپ میں ایک تخلیق (CREATION) ہے یہ کسی دوسرے واقعے کا ردِعمل نہیں ہے۔ اب تک جو کہا جاتا رہا ہے کہ ہر عمل کسی عمل کا ردِعمل ہے یا یہ کہ THE IS A REACTION TO EVERY ACTION یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔

25/جون 2000ء کو یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک قدیم چڑیا کا فوسل (FOSSIL) جو لاکھوں سال بعد دریافت ہوا وہ بھی چڑیا ہی تھا یعنی لاکھوں سال پہلے سے اب تک اِس چڑیا میں کوئی ارتقا (EVOLUTION) نہیں ہوا۔ آج کی چڑیا بھی بالکل وہی چڑیا ہے جو لاکھوں سال پہلے تھی۔ 2008ء میں انسانی جینوم (JENOME) پراجیکٹ مکمل ہوا ہے۔ جس میں زندگی کے حیاتیاتی میک اپ (BIOLOGICAL MAKEUP) کا مکمل نقشہ تیار کیا گیا جو اِس

صدی کا بڑا سائنسی کارنامہ ہے۔اس پراجیکٹ کے نتیجے میں یہ بات اور واضح ہوگئی ہے کہ خدا کی تخلیق جو انسان کی شکل میں ودیعت کی گئی ہے وہ زندہ اشیاء میں سب سے عظیم تخلیق ہے۔ماہرین ارتقاء کوشش کر رہے ہیں کہ انسانی جین (JENE) اور جانوروں کے جین میں مشابہت کی افواہ پھیلا کر کچھ مواد، اپنے مطلب کا نکالنے میں کامیاب ہوجائیں،مگر حقیقت یہ ہے کہ دانشوروں اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد نظریۂ تخلیق (CREATIONIST) کی حامی ہوتی جارہی ہے جن کا یہ اعتراف ہے کہ دنیا کسی عظیم قوت کی قوتِ تخلیق سے وجود میں آئی ہے بتدریج ترقی کے مراحل سے گزرتی ہوئی اپنی موجودہ حالت کو نہیں پہنچتی ہے۔آئندہ جو مختصر تفصیلات بیان ہوں گی، اُن کی روشنی میں آپ خود اندازہ لگاسکیں گے کہ خدا ناشناس سائنس اب اپنے اختتام کو پہنچے والی ہے اور 21ویں صدی انسان کو اپنے کھوئے ہوئے خدا سے پھر ملادی گئی۔

ڈی این اے، زندگی کا کوڈ

ڈی این اے میں موجود فرمانِ الٰہی جب سائنس کی سمجھ میں آنے لگا تو سب سے پہلے یہ مانا جانے لگا کہ زندہ اشیا ایسی مکمل اور پیچیدہ ترتیب وترکیب کا مرکب ہیں کہ یہ حادثاتی طور پر کسی اتفاق کے تحت وجود میں نہیں آسکتیں۔ جب تک اِن میں کسی بڑے ماہر اور قادرِ مطلق بنانے والے کی کارگزاری شامل نہ ہو۔اگر کسی مقام پر اینٹ، پتھر، گارا، مٹی، قالین، ائیر کنڈیشنر، ٹی وی، ریفریجریٹر اور تمام رہائشی سامان موجود ہو اور پھر اچانک ایک حادثہ یا اتفاقی واقعہ ایسا ہوجائے کہ یہ سب مل کر بادشاہ سلامت کا محل بن کر اُبھر آئے۔ یہ جادو کی کہانی تو ہوسکتی ہے ایک سائنسی حقیقت کبھی نہیں ہوسکتی۔ اب ڈی این اے میں چھپے ہوئے تین بلین یا تین ارب کیمیائی حروف کو (DECODE) کرنا اور انسانی ڈی این اے میں موجود 85فی صد ڈاٹا صحیح ترتیب وسلسلے (SEQUENCE) میں لانا ممکن ہوگا۔اتنا اہم اور کامیاب پراجیکٹ بھی اُس کے لیڈر ڈاکٹر فرانسس کولنز (FRANCIS COLLINS) کے بقول ابھی پہلا قدم ہے جو ڈی این اے میں چھپی معلومات حاصل کرنے کی طرف اُٹھایا گیا ہے۔معلومات کے اِس ذخیرے کو حاصل کرنے میں اتنا زمانہ کیوں لگا، اس سوال کا جواب ملے گا اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ڈی این اے میں کس نوعیت کی معلومات پوشیدہ ہیں۔

ڈی این اے کی دنیا

ڈی این اے ہمارے جسم کے 100 ٹریلین خلیوں میں سے ہر ایک خلیے کے مرکز (NUCLEUS) میں بڑی حفاظت سے موجود ہوتا ہے۔ ہر خلیے کا قطر 10 مائیکرون (MICRON) ہوتا ہے۔ مائیکرون 10^{-6}m کو کہتے ہیں۔ گویا میٹر کا دس لاکھواں حصہ یا ملی میٹر کا ایک ہزاروں حصہ، اتنے چھوٹے خلیے کے درمیان ڈی این اے محفوظ ہوتا ہے۔ اِس ڈی این اے میں انسانی جسم کی ساخت اور بناوٹ کی تمام تر تفصیلات اتنی وسعت، گیرائی اور گہرائی کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں کہ اس کا وجود اللہ رب العزت کی صناعی کی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اپنے سمجھنے کے لئے اِن معلومات کو صرف سلسلۂ ترتیب میں لاکر انسان پھولا نہیں سما رہا ہے۔ اِس علم کو ایک عظیم الشان شعبۂ علم سے وابستہ کرکے اِس کو جینیات (GENTICS) کا نام دیا گیا ہے۔ 21ویں صدی کی یہ عملی شق ابھی گھٹنوں چلنے کی عمر میں ہے۔ اِس میدان میں ابھی اور نہ جانے کیا کیا انکشاف ہونے ہیں۔

ڈی این اے میں زندگی

آج مثلاً 25 سال کی عمر میں ہم اپنا سراپا آئینے میں دیکھیں تو یہ بے داغ جسم، یہ حسین و پرکشش شکل وشباہت، یہ صحت وتندرستی، یہ علم ودانش سے آراستہ ذہن وعقل کس طور ترقی کرتے ہوئے اِس حال کو پہنچیں گے، یہ علم 25 سال اور نو ماہ پہلے اُس ڈی این اے میں لکھ دیا گیا تھا، جو ماں کے پیٹ میں سب سے پہلے بارآور شدہ بیضے (FERTILIZED EGG) کے خلیے کی شکل میں نمو پایا تھا۔

اتنا ہی نہیں، ہماری لمبائی، چوڑائی، وزن، ناک نقشہ، چہرہ مہرہ، بالوں اور آنکھوں کا رنگ، جلد کی رنگ، خون کی قسم وغیرہ نطفہ ٹھیرنے سے شروع ہوکر، موت تک روز بروز ماہ بہ ماہ، سال بہ سال تبدیلیوں کا حال ایک مکمل تسلسل کے ساتھ ڈی این اے میں موجود رہتا ہے۔ مثلاً اِس میں لکھا رہتا ہے کہ کب کب خون کا دباؤ زیادہ ہوگا اور کب کم رہے گا۔ کب سر کا پہلا بال سفید ہوگا اور کب دور کی اور قریب کی نظر کمزور ہوجائے گی۔

انسانی خلیے میں ضخیم انسائیکلو پیڈیا

ہم معلومات کے ذخیروں کو انسائیکلو پیڈیا کی طرز پر جانتے ہیں۔ڈی این اے میں پوشیدہ معلومات کا ذخیرہ کوئی معمولی ذخیرہ نہیں۔ایک ڈی این اے میں موجود معلومات کو اگر کتابی شکل میں منتقل کیا جائے تو یہ برطانوی انسائیکلو پیڈیا کے دس لاکھ صفحات پر مکمل ہوگا۔

ذرا تصور کریں کہ انسانی جسم کے سوٹریلین خلیوں میں سے ہر خلیے کے مرکز کے اندر ایک مالیکیول (MOLECULE) جس کا نام ڈی این اے ہے، ملتا ہے۔اِس کا سائز ایک ملی میٹر کا ایک ہزاروں حصہ ہے اور اِس میں وہ معلومات درج ہیں، جو دنیا کے سب سے بڑے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا سے چالیس گناہ زیادہ ہیں، جو اِسی انسائیکلو پیڈیا جیسی 920 جلدوں میں سما سکے گا، جس میں متعدد معلومات کی پانچ بلین قسمیں یا جزئیات (PIECES) محفوظ ہیں۔اگر ہر ایک جز کو پڑھنے پر صرف ایک سیکنڈ صرف کیا جائے اور چوبیس گھنٹے متواتر پڑھنے کا سلسلہ رہے تو اِسے ایک بار پڑھنے کے لئے سو سال لگ جائیں گے۔920 جلدوں کی اِن کتابوں کو اگر ایک دوسرے کے اُوپر سجایا جائے گا تو 70 میٹر اُونچا کتابوں کا مینار تیار ہو جائے گا۔یہ سب معلومات اِس ذرے میں سمودی گئی ہیں، جو پروٹین، چربی اور پانی کے چند مالی کیولوں سے مرکب ہے۔

جی جی تھامسن نے لکھا تھا کہ ہماری زمین پر کل جان دار اشیا ایک ہزار ملین ہیں۔اِن تمام اشیا کی معلومات ڈی این اے کی شکل میں جمع کی جائیں تو چائے کے ایک چمچے میں آجائیں گی اور پھر بھی جگہ خالی رہے گی۔

خلیے میں دانائی

جسم انسانی کے سارے سوٹریلین خلیے عجب حکمت اور دانش مندی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔یہ بظاہر بے جان ایٹموں کا مجموعہ ایک بے روح شے ہونا چاہئے۔ہم اگر تمام عناصر کے ایٹم جمع بھی کر لیں، اِن کو کسی بھی ترتیب سے لگا لیں، مگر وہ دماغ، وہ سمجھ بوجھ اِس ذخیرۂ ایٹم سے حاصل نہیں کر سکتے، جو کسی عمل کو سلیقے، سلسلے اور ترتیب کے ساتھ انجام دینے کے لئے ضروری ہے۔جس طرح ہر عقل و سمجھ والے کام کے لئے ضروری ہے کہ کسی دانش مند نے اُس کام کو انجام

دیا ہو، وہ کمپیوٹر ہو یا کوئی اور کام، اِسی طرح ڈی این اے بھی اپنے بنانے والے سے عقل و دانش اور سمجھ بوجھ لے کر آیا ہے۔

ڈی این اے کی زبان اور قوتِ گویائی

ہماری زبان میں 'الف' سے 'ے' تک حروفِ تہجی ہیں۔ انگریزی میں A سے Z تک 26 حروف سے بنتی ہے۔ ڈی این اے کی زبان میں صرف چار حروف ہیں، A.T.G.C اِن میں سے ہر ایک حرف اُن خاص بنیادوں (BASES) میں سے ایک ہے جو نیوکلیوٹائیڈس (NUCLEOTIDES) کہلاتے ہیں۔ دسیوں لاکھ BASES ایک ڈی این اے میں قطار در قطار ایک بامعنی ترتیب اور سلسلے کی کڑی بنائے رکھتے ہیں اور یہ سب مل کر ایک ڈی این اے کا مالی کیول بناتے ہیں۔

A.T.G اور C میں سے کوئی دو مل کر ایک اساسی جوڑا بناتے ہیں، جسے اساسی جوڑا (BASE PAIR) ہی کہا جاتا ہے۔ یہی اساسی جوڑے اُوپر تلے جمع ہو کر جین بن جاتے ہیں۔ ہر جین جو کسی مالی کیول ڈی این اے کا حصہ ہوتا ہے، انسانی جسم کے کسی نہ کسی حصہ کے بارے میں معلومات محفوظ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ اُس جسمانی حصے کی نمایاں خصوصیات، وضع قطع، ڈیل ڈول، ہیئت، خدوخال، صورت، شکل، حلیہ، رنگ و روپ جو کسی فردِ خاص کی انفرادیت سے متعلق مفصل کیفیت کہی جاسکتی ہے، اِس جین میں درج ہوتی ہے۔ اب انسان کی لاتعداد خصوصیات ہیں۔ یہ لمبائی ہو، آنکھوں کا رنگ ہو، ناک بھوں کی ندرتیں ہوں یا کان بڑا یا چھوٹا ہو، یہ سب جین میں موجود پروگرام کے مطابق بنتے اور سنورتے جاتے ہیں اور جسم کا ہر ہر حصہ جین کے حکم کے مطابق پروان چڑھتا ہے۔

ایک انسانی خلیے کے ایک ڈی این اے میں دو لاکھ جین ہوتے ہیں۔ ہر جین مخصوص نیوکلیوٹائیڈس کے بالکل انفرادی سلسلۂ ترتیب سے بنا ہوتا ہے۔ اِن نیوکلیوٹائیڈس کی تعداد اُس پروٹین کی قسم پر منحصر ہوتی ہے جس سے یہ وجود پاتا ہے۔ پروٹین کی یہ تعداد ایک ہزار سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار تک ہوسکتی ہے۔ اِس جین میں جسم انسانی میں موجود دو لاکھ قسموں کی پروٹین کا کوڈ بھی چھپا ہوتا ہے اور وہ نظام بھی موجود رہتا ہے، جس کے تحت یہ تمام پروٹین ضرورت کے مطابق جسم

میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

خیال رہے کہ ایک جین بے چارہ ڈی این اے کا صرف ایک معمولی سا حصہ ہے۔ دو لاکھ جینز میں محفوظ معلومات یا کوڈ، ڈی این اے میں موجود کل معلومات کا صرف تین فی صد ہی ہوتی ہیں۔ ستانوے فی صد دفترِ علم ابھی ہمارے بساطِ آگہی کے لئے پردہ راز میں ہے۔ یہ بات تو مان لی گئی ہے کہ یہ ستانوے فی صد دفترِ علم جس تک ابھی انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوسکی ہے انسانی خلیے کی بقا اور اُن مکانیات (MECHANISM) سے متعلق جو انسانی جسم میں انتہائی پیچیدہ عوامل کے کنٹرول کا باعث ہوتے ہیں بڑی ناگزیر معلومات رکھتے ہیں۔ صرف تین فی صد معلومات کا پتا ملنے پر عقل انسانی حیران ہے دانش وفکر پر سکتہ طاری ہے، ابھی مزید ستانوے فی صد پوشیدہ معلومات تک پہنچنا ایک لمبا سفر ہے جو جاری ہے۔

جین خود بھی کروموسوم (CHROMOSOMES) میں واقع ہوتے ہیں۔ جنسی خلیے کے علاوہ ہر انسانی خلیے میں 46 کروموسوم ہوتے ہیں۔ ہر کروموسوم ایک کتابِ علم کی طرح ہے کہ ایک انسان کے متعلق تمام معلومات 46 جلدوں کی کتابوں میں بند رہتی ہیں اور یہ سب بسیط معلومات کا وہ خزانہ ہے کہ جسے ورقِ کتاب پر لایا جائے تو برطانوی انسائیکلوپیڈیا کی 920 جلدوں تک پھیل جائے۔

ہر انسان کے ڈی این اے میں حروف A.T.G اور C کا سلسلہ (SEQUENCE) مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روئے زمین پر جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں اور قیامت تک جو اسی طرح پیدا ہوتے رہیں گے وہ تمام کے تمام ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ذرا سوچیں کہ ہر انسان کے تمام اعضا کا نام مختلف نہیں ہے یعنی آنکھ، ناک، منہ، دل گردہ وغیرہ سب کے پاس ہے۔ پھر بھی ہر شخص کچھ ایسے خاص انفرادی اور بڑے تفصیلی طریقے پر پیدا ہوا ہے کہ سب کے سب ایک خلیے کے تقسیم در تقسیم ہونے کے عمل سے پروان چڑھنے کے باوجود ایک ہی بنیادی بناوٹ رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہمارے تمام اعضا ایک منصوبے کے تحت پروان چڑھتے ہیں، جو ہمارے جین میں لکھا ہوا ہے۔ سائنس دانوں نے جو خاکہ مکمل کیا ہے اُس کے تحت جسم کے مختلف اعضاء کو کنٹرول کرنے

والی جین کی تعداد مختلف ہے۔ مثلاً ہماری کھال کو جو جین کنٹرول کرتی ہیں اُن کی تعداد 2559 ہے۔ اِسی طرح دماغ کو 29930، آنکھ کو 1794، لعابِ دہن کو 186، دل کو 6216، سینے کو 4001، پھیپھڑوں کو 11581، جگر کو 2309، آنتوں کو 3838، دماغی پٹھوں کو 1911 اور خون کے سیل کو 2292 جین کنٹرول کرتی ہیں۔

ڈی این اے کے حروف کا سلسلۂ ترتیب انسانی بناوٹ کی تمام تر تفصیلات طے کرتا ہے۔ معمولی سے معمولی ترتیب بھی اِس کے احاطے میں ہے۔ صرف آنکھ، ناک، چہرہ مہرہ اور ظاہری حسن و جمال ہی نہیں، ایک سیل میں نصب ڈی این اے انسانی جسم میں موجود 206 ہڈیوں، 600 پٹھوں (MUSCLES) اور دس ہزار (AUDITORY) کان سے متعلق پٹھے کے نیٹ ورک اور بیس لاکھ (OPTIC NERVES) آنکھ سے متعلق اور 100 بلین NERVE CELLS اور تمام کے تمام سوٹر لین خلیوں کا مکمل ڈیزائن اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے۔

اِس وسیع سمندر کا اندازہ لگائیے اور علم کی کائنات کی سب سے پیچیدہ مشین 'آدمی' کی جسم و عقل اور فہم ادراک کے پروان چڑھنے کا علم حیرت انگیز طور پر ایک ڈی این اے میں قطار در قطار جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ڈی این اے کے حروف کے سلسلۂ ترتیب (SEQUENCE) میں ذرا بھی نقص رہ جائے تو ممکن ہے آپ کی آنکھیں چہرے مہرے پر ہونے کے بجائے آپ کی گھٹنے پر نمودار ہو جائیں اور آپ کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں، سر اور کمر اپنے موجودہ مقام سے ہٹ کر کسی بے ہنگم جگہ پر وارد ہو جائیں، ڈی این اے کا یہ مکمل نظام آپ کے بے داغ ڈیل ڈول اور ہر اعتبار سے مکمل انسان ہونے کا ضامن ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ ڈی این اے کا منظّم سلسلہ کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے یا ناگہانی واقعہ ہے تو کوئی کم عقل بھی یہ بات نہ مانے گا۔ اتفاقات کا امکان یا احتمال، ریاضی میں امکان (PROBABILITY) کے حساب سے معلوم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نسبت ہے کہ جو کسی اغلب حالت کو جملہ ممکنہ حالات سے ہو۔ آج ریاضیات نے یہ بھی حساب لگا دیا ہے کہ محض اتفاق سے ایک ڈی این اے کے دو لاکھ جین میں سے کسی ایک جین کی بھی ترتیب اس مخصوص سلسلے سے ہموار ہو جانے کی نسبت صفر کے برابر ہے۔

فرینک سالسبری (FRANK SALISBURY) جو خود ایک ارتقاء کو ماننے والا سائنسدان ہے کہتا ہے کہ: ایک درمیانی درجے کے پروٹین میں تین سو کے قریب (AMINO ACIDS) ہوتے ہیں۔ اس کو کنٹرول کرنے والے ڈی این اے جین میں تقریباً ایک ہزار نیوکلیوٹائیڈ کی ایک کڑی ہوگی۔ چونکہ ایک ڈی این اے کڑی میں چار قسم (C,G,T,A) کے نیوکلیوٹائیڈ ہوتے ہیں۔ اس لئے سولنگ والی کڑیاں 41000 قسموں کی ہوں گی۔ الجبرا کے ذریعے سے LOGRITHMS کے استعمال سے 41000 کا مطلب ہوا 10^{600}، یعنی 10 کو 10 سے 600 مرتبہ ضرب کرنے سے ایک کے بعد ایک 600 صفر لگانے سے جو ہندسہ بنے گا۔ یہ وہ عدد ہے جس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

مزید وضاحت اس طرح کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام ضروری نیوکلیوٹائیڈ بھی کہیں موجود ہیں اور ان کو مجتمع کرنے والے تمام پیچیدہ مالی کیول اور خامرے (ENZYMES) بھی سب مہیا کر دیے گئے ہیں تو ان نیوکلیوٹائیڈ کا خاطر خواہ (SEQUENCE) میں ترتیب پا جانے کا امکان 10^{600} میں سے صرف ایک دفعہ کا ہے ناممکن کہیں تو کم ہے۔

فرانسس کرک (FRANCIS CRICK) کو ڈی این اے کی ریسرچ پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ خود بڑا پکا حامی ارتقا تھا مگر کہتا ہے کہ:

> ''ایک انصاف پسند انسان، اس معلومات کی روشنی میں جواب تک ہمارے پاس ہے صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ ایک خاص معنی میں انسانی زندگی کی ابتداء اس وقت تو ایک کرشمہ ہی معلوم ہوتی ہے۔''

خیال رہے کہ بچوں میں HAEMOPHILIA LEUKEMIA ڈی این اے کے کوڈ میں خرابی واقع ہو جانے سے ہوتا ہے۔ کینسر کی تمام اقسام اسی نازک توازن کے بگڑ جانے سے ہوتی ہیں۔ یہ خرابی کسی بھی ایک ڈی این اے کے کسی ایک اساسی جوڑے میں توازن نہ ہونے سے ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی C,G,T,A حروف میں مثلاً ایک بلین 618 ملین 457 ہزار اور 632 ویں اساسی جوڑوں میں ہوسکتی ہے۔ اتنی کثیر تعداد میں اساسی جوڑے، ہر خلیے میں ڈی این اے اور تمام ٹوٹتے بنتے اور تقسیم در تقسیم ہوتے خلیوں میں توازن برقرار رکھنے کا نظام

بھی ڈی این اے کے کوڈ میں چھپا ہوتا ہے۔

ڈی این اے کا اپنی نقل بنانے کا عمل

ڈی این اے کی تحیر خیز دنیا میں اپنی ہی نقل یا خود ساختہ نقش ثانی (SELF REPLICATION) بنانے کا عمل انتہائی تیزی سے جاری رہتا ہے۔سب جانتے ہیں کہ انسانی جسم کی ابتداء ماں کے پیٹ میں ایک خلیے سے ہوتی ہے۔پھر یہ خلیہ تقسیم ہو جاتا ہے اور نئے خلیے وجود میں آتے جاتے ہیں جو کہ ایک سے دو، دو سے چار، اور اسی طرح 4-16، 8-64، 32-128 کی نسبت سے تقسیم ہو کر جنم لیتے جاتے ہیں۔

خلیہ تقسیم ہو کر دوسرا خلیہ بناتا ہے اور ہر خلیے کو ایک ڈی این اے چاہئے اور ڈی این اے کڑی خلیے میں ایک ہی ہوتی ہے۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہر تقسیم ہوتا ہوا خلیہ اپنا ہم شکل خود پیدا کرتا ہے۔ ہر خلیہ ایک خاص سائز کا ہوتا ہے۔تقسیم ہو کر دوسرا خلیہ بنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔خلیے میں شعور اور یہ ایقان کہاں سے آیا، خلیے کے ساتھ ساتھ ڈی این اے کی تقسیم کا خفیہ عمل بڑے دلچسپ طریقے پر ہوتا ہے۔

ڈی این اے کا مالیکیول جو شکل میں ایک چکر دار زینے کی طرح ہوتا ہے، تقسیم ہو کر دو حصوں میں ZIP کی طرح کھل جاتا ہے۔ یہ دونوں طرف سے غائب اُدھورے حصے اسی اطراف میں موجود مادہ سے اپنی انوکھی تکمیل کو پہنچتے ہیں اور ایک سے دوسرا ڈی این اے وجود میں آجاتا ہے۔تقسیم کے ہر دور میں خاص پروٹین اور خامرہ کسی ماہر روبوٹ (ROBOT) کی طرح کام کرتے رہتے ہیں۔تمام تفصیل کا ذکر ممکن ہے مگر اس کے لئے بہت سے صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔

خامرے (ENZYMES) وہ کارندے ہیں جو ہر قدم پر یہ چیک کرتے ہیں کہ کوئی غلطی اگر ہوگئی ہو تو فوری طور پر اس کی اصلاح ہو جائے۔ ہر منٹ میں تین ہزار اساسی جوڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور نگرانی کرنے والے خامرے ضروری ترمیم، اصلاح اور ردو بدل بھی کرتے جاتے ہیں۔تاکہ نئے پیدا ہونے ڈی این اے میں غلطی کا امکان نہ رہے۔اس لئے ڈی این اے کے حکم سے مرمت کر سکنے والے زیادہ خامرے پیدا ہوتے ہیں۔گویا ڈی این اے میں خود اپنی

حفاظت کا اپنی افزائش نسل کا اور نسلوں کو محفوظ اور برقرار رکھنے کا مکمل پروگرام کوڈ کیا ہوا ہوتا ہے۔

اب دیکھئے کہ خلیے پیدا ہوتے ہیں اور مرتے جاتے ہیں۔آپ کے جسم میں جو خلیے چھ ماہ پہلے تھے اُن میں سے آج ایک بھی باقی نہیں ہے۔ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔میرے سب خلیے مر چکے ہیں مگر میں زندہ ہوں۔اس لئے کہ ہر خلیے نے بروقت اپنا ہم زاد پیدا کرنے کا عمل مکمل کرلیا تھا۔یہ عمل انتہائی مہارت سے مکمل ہوتا ہے کہ کسی غلطی کا امکان تین بلین اساسی جوڑوں میں سے صرف ایک میں ہوسکتا ہے اور یہ غلطی بھی بڑے اعلیٰ تکنیکی انداز میں سنوار دی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خامرے جو پل پل ٹوٹتے، بنتے بکھرتے اور سنورتے اور ڈی این اے کو پیدا کرنے کی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔وہ دراصل مختلف قسم کی پروٹین ہیں جن کے پیدا ہونے کی ترتیب اور سلسلہ بھی اسی ڈی این اے میں کوڈ کیا ہوا ہے اور ڈی این اے کے حکم کے تابع اُن کا نظام چلتا ہے جس کی افزائش کی دیکھ بھال اُن کو کرنی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

تبصرہ وتعارف کتب

تبصرہ نگار: انجینئر مختار فاروقی

1

حضرت مسیح علیہ السلام کے اللہ کا بندہ اور رسول ہونے پر

سینکڑوں دلائل

اردو ترجمہ: مائة دليل على ان المسيح عبدالله ورسوله

ترتیب: الشيخ محمد بكير الامين مصرى

ترجمہ: خانم حمیرا یاسمین صاحبہ

ناشر: مرکز تحقیق اسلامی جامعہ اسلامیہ (ٹرسٹ) کامونکے، ضلع گوجرانوالہ

'عیسائیت' کے نام پر پاکستان میں جن افکار و
نظریات اور دین باطل کی ترویج و اشاعت کی جارہی ہے

وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مولانا عبدالرؤف فاروقی صاحب اس میدان میں پوری اُمت کی طرف سے 'فرضِ کفایہ' ادا کر رہے ہیں۔ ان کا جریدہ 'مکالمہ بین المذاہب' بھی اور ان کا ادارہ مرکز تحقیق اسلامی جامعہ اسلامیہ (ٹرسٹ) کامونکے ضلع گوجرانوالہ پاکستان ـــــ بھی انہیں مساعی جملہ میں مصروف ہے۔

عیسائیت کا لفظ 'عیسیٰ' سے ماخوذ ہے اور بظاہر لگتا ہے کہ عیسائیت میں داخل لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں گے۔ مگر درحقیقت عیسائیت کے نام سے شرک اور گمراہی کی بدترین اقسام ہیں جو پاکستان کے مسلمان عوام کے ذہنوں میں اتاری جارہی ہیں۔ اگر عیسائیت کے فروغ کے اعداد و شمار دیکھیں تو ممکن ہے کہ ہر دردمند مسلمان کے ہوش حواس اُڑ جائیں اور یہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی دورِ غلامی کا منحوس سلسلہ جاری ہے اور اُمت مسلمہ میں

ارتداد کا ایک راستہ۔ اس ارتداد کے پیچھے کون کون ہیں اور ہم نے اپنے ملک پاکستان میں غیر مسلموں کو تبلیغ کی اجازت دے کر کیا مراعات حاصل کی ہیں؟ اور سرکاری سطح پر اس کا کیا تدارک کیا جائے یہ الگ موضوع ہے۔ تاہم ـــــ 'عیسائیت' کی نسبت سے جو افکار ونظریات مسلمانانِ پاکستان کے ایک طبقے کے ذہن میں ڈالے جا رہے ہیں وہ اللہ، وحی، آخرت، پیغمبر، رسول وغیرہ کے تصورات سے عاری اور مبرا ہیں۔

ہمارے نزدیک مولانا عبدالرؤف فاروقی اور ان کا ادارہ اپنے مشن کے ذریعے اُمت مسلمہ میں ارتداد کا راستہ روکنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ لائق تحسین بھی ہیں، قابل داد بھی۔

مولانا صاحب کے ادارہ کی ایک مطبوعہ کتاب ہمارے مطالعہ میں آئی ہے جس کا نام ہی اپنے مضامین کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ یہ کتاب دراصل ترجمہ ہے ایک عربی کتاب کا جو مصر سے عرصہ پہلے طبع ہوئی اور اب اُردو میں ترجمہ کر کے پاکستان کے دردمند مسلمانوں کے مطالعہ کے لئے پیش کی گئی ہے تاکہ ہر دردمند مسلمان اپنی اپنی جگہ ـــــ اُمت مسلمہ کے اندر جاری اس ارتداد سے بے چین ہو جائے اور اس ضمن میں اپنے حصہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اس کتاب کے سات ابواب ہیں:

● الباب الاوّل: انجیلوں سے دلائل ● الباب الثانی: عقلی دلائل ● الباب الثالث: تاریخی دلائل ● الباب الرابع: مسیحی علماء کے بعض دلائل ● الباب الخامس: کلیسیا کی مجالس کے فیصلوں سے دلائل ● الباب السادس: بت پرستی سے مشابہ ادیان سے دلائل ● الباب السابع: قرآن کریم سے دلائل

کتاب کا ترجمہ سلیس مربوط اور عام فہم ہے۔ ذرا سا دینی ذوق آدمی کو کتاب شروع کر کے ختم کئے بغیر رکھنے نہیں دے گا۔ کتاب میں درج دلائل محققانہ ہیں اور ٹھوس حوالہ جات پر مشتمل ہیں لہٰذا یہ کتاب دینی ذوق رکھنے والے ہر مسلمان تک پہنچنا ضروری ہے عیسائی برادری کے واقف حضرات تک بھی از راہِ 'اتمامِ حجت' پہنچانا ثواب واجر کا باعث ہوگا۔

ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور ادارہ کو اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ آمین

2

جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست

الیکشن 2013ء میں جماعت کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ

مرتب: پروفیسر طارق بٹ

شائع کردہ: یورپ اکیڈمی اسلام آباد پاکستان 051-2317092

یہ کتاب پاکستان میں 2013ء کے الیکشن کے نتائج میں جماعت اسلامی کی شدید ناکامی پر جماعت سے دردمندی کا تعلق رکھنے والے حضرات مثلاً ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، مولانا خلیل الرحمٰن چشتی، ڈاکٹر محمد امین اور دیگر اہل علم کے مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر تحریر سے دردمندی کے جذبات جھلکتے ہیں۔ یہ کتاب جماعت اسلامی سے جذباتی تعلق رکھنے والے ہر شخص کو مطالعہ کرنی چاہئے تاکہ آئندہ کا صحیح لائحۂ عمل تیار کیا جا سکے۔

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی صاحب ایک عظیم بیدار مغز مذہبی دانشور تھے جنہوں نے اسلامی مذہبی ماحول میں پرروش پائی تھی اور مغرب کے افکار کا بھی کھلی آنکھوں اور کھلے دماغ کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی تشکیل ان کے اسلام کی سربلندی کے لئے نظریاتی بنیادوں پر کام کرنے کی حتمی شکل تھی۔ مولانا مودودی کی نگاہ نے 'رفتارِ زمانہ' کو بھانپنے میں اپنی خود اعتمادی کی وجہ سے UNDER ESTIMATE کیا اور ان کی توقعات وخدشات سے کہیں جلدی علامہ اقبال کی شاعری سے بیدار ہونے والی مسلمان اُمت نے انہیں کے نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے ایک عظیم ریاست قائم کر دی۔ مولانا مودودی صاحب کے لئے اپنے نظریاتی کام کے لئے 'بھارت' زیادہ موزوں تھا مگر بعض تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی وجہ سے مولانا مودودی صاحب نے پاکستان آنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہاں آکر وہ نظریاتی کام اور عملی سیاست کے دوناقابل عبور انتہاؤں میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ انہیں اس کا احساس جلد ہو گیا تھا مگر جماعت تاحال اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ خلاصہ ہے ان نگارشات کا جو اس کتاب میں مختلف ہمدردانِ

جماعت نے سپردِ قلم کی ہیں۔

ہمارے نزدیک مولانا مودودی صاحب کا نظریاتی کام ایک خاص رُخ پر تھا اور اس کے منطقی نتائج بھی سامنے ہیں۔ اُصولوں کو بدلے بغیر طریق کار بدلنے کا فائدہ نہیں اُلٹا نقصان ہی ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آج اُمت مسلمہ 150 کروڑ افراد کا مجموعہ ہے اور اس میں سینکڑوں قسم کے خیالات اور دینی تشریحات کا وجود اچھنبے کی بات نہیں قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کی موجودگی میں صرف یہ غنیمت ہے کہ یہ انتشار دوسری قوموں اور مذاہب کی نسبت کم ہے اور مختلف مسالک اور ان کے اکابرین دلیل کی بات سنتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں عوام کی سطح کے مقررین و واعظین کا معاملہ دوسرا ہے۔

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی آراء کا اختلاف تھا جو بعد میں پھیلا تو کچھ اُصولوں کی بنا پر چار فقہی مذاہب کی شکل میں سامنے آیا۔ اصحاب ظاہر کا معاملہ بھی دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے تھا لہٰذا ـــــ اہل سنت میں ایک فقہی تقسیم چار فقہی مذاہب اور اصحابِ ظاہر کا مسلک ہے اور بلاشبہ ہر گروہ میں بہت بھاری بھرکم علمی و روحانی شخصیات موجود ہیں۔ اس طرح نظریات کی سطح پر، جنہیں مرورِ زمانہ کے ساتھ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد 'عقائد' کا نام دیا گیا، دو علیحدہ علیحدہ دھارے وجود میں آ گئے ایک سلسلہ اشاعرہ ماتریدیہ سے ہو کر 'عقیدہ طحاویہ اور عقائد نسفی' کے نام سے موسوم ہوا ـــــ تو دوسرا عقیدہ واسطیہ کے نام سے ہمارے علمی ورثہ میں موجود ہے۔

عقائد کے میدان میں یہ فرق صرف تعبیر کا فرق ہے حقیقت ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ، فرشتے، آخرت، روح، وحی، جنت و دوزخ، احوال قبر وغیرہ وغیرہ بس ان کو سمجھ کر بیان کرنے میں بہت اختلافات ہو سکتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صرف دو نقطہ ہائے نظر تک یہ اختلاف محدود ہو گیا ہے۔ اب عملاً ایک ہزار سال سے جو شخص بھی اُمت میں نمایاں ہوتا ہے اور کوئی دینی علمی کام کرتا ہے وہ پانچ فقہی مسالک میں سے ایک اور عقائد کی دنیا میں دو نقطہ ہائے نظر میں سے کسی کا ضرور اسیر نظر آتا ہے۔ پہلے نقطۂ نظر کے حامل شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں جبکہ دوسرے نقطۂ نظر کے حامل امام ابن تیمیہ، شیخ محمد بن عبدالوہاب،

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔

ایک ہزار سالہ تاریخ کے نتیجے میں سیاسی، جغرافیائی اور دیگر متعدد عوامل کی وجہ سے اسلامی دنیا میں کہیں ایک قسم کے فقہی مذہب کا فروغ ہوا اور وسیع علاقہ اس کے زیر اثر چلا گیا، کہیں دوسرے مذہب کا۔ اور نظریاتی سطح پر بھی کسی علاقے میں ایک نقطۂ نظر کو قبولِ عام حاصل ہو گیا اور کہیں دوسرے نقطۂ نظر کو۔

جنوبی ایشیا میں اگرچہ اسلام کا دورِ اوّل دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور دور بنو اُمیہ کا ہے جب محمد بن قاسم نے ہند پر حملہ کر کے اسلامی حکومت قائم کر دی یہ حکومت جلد ہی انتہا پسندی کے نظریات کے حاملین (اسماعیلی شیعہ) کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جبکہ دورِ ثانی محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی فتوحات کے بعد 1206ء میں اسلامی حکومت کے قیام سے شروع ہوا۔ اس اسلامی حکومت کے قیام اور عوام کو مسلمان بنانے میں صوفیاء صالحین کا بڑا کردار تھا ـــــ گویا پورا (غالب اکثریت) جنوبی ایشیا شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی اور ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کا حامل بھی بنا اور فقہ حنفی کا ایک مضبوط گڑھ بھی۔ یہاں مجددین کے ہاتھوں اصلاحی کام بھی ہوا تو ان فقہی اور نظریاتی دائروں کے اندر اندر ہی۔

اس تفصیل کے بعد ہی یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ مولانا مودودی صاحب نے نظریاتی کام کا آغاز کیا وہ مذہباً علمائے ظاہر میں سے تھے (یعنی کسی فقہی مذہب کے پیروکار نہیں تھے) اور 'عقیدۃً' اور نظریاتی سطح پر وہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار تھے۔

ان کا کام ہمارے نزدیک نظریاتی سطح کا..... ہر باصلاحیت اور دردمند مسلمان کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کوشش کرنے کا ہر شخص کو حق ہے اور اپنے مذہب و نظریہ کو پھیلانے کا بھی، اس میں نہ چاہتے ہوئے بھی بعض اوقات مناظرے، مناقشات، تلخیاں ہو جانا انسانی طبائع کے اختلاف کا نتیجہ اور فطری امر ہے۔ اس سے نفس مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریاتی کام ـــــ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نزدیک بھی ٹھیٹھ اُصولی اسلامی نظریات کے قریب تھا۔ وہ یہ کام کرتے رہتے تو اس پر کوئی قدغن نہ پہلے تھی نہ آج ہے حتیٰ کہ ان کے پیروکاروں کا حلقہ وسیع ہو کر کسی ایک علاقہ میں اپنی آزاد حکومت بنانے میں

کامیاب ہوجاتے۔ مگر اُنہوں نے پاکستان بننے کے بعد ایک دوسرا راستہ اختیار کر کے اپنے نظریات اور مذہب پر حنفی اور غزالی و رومی و ابن عربی کے ماننے والوں سے مہر تصدیق ثبت کرا کر حکومت بنانے کی کوشش کی جو یقیناً ناکام ہونی تھی اور ہو رہی ہے اور ہوتے رہی گی جب تک اس ملک کے عوام کی اکثریت علمائے ظاہر کے مسلک (سلفیت، اہل حدیث) کے حامل نہیں ہوجاتے اور امام غزالی و رومی و ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کو خیر باد کہہ کر کے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کو اختیار نہیں کر لیتے۔

ہمارے نزدیک نظریاتی کام کے تقاضے اور تھے اور سیاسی کامیابی کے تقاضے اور تھے ـــــ مولانا مودودی صاحب اور ان کی جماعت اس تضاد کا شکار ہے۔ کامیابی کی صورت موجود ہے کہ وہ عوام کے مذہب اور نظریات قبول کرنے کا صدقِ دل سے اعلان کر دیں ـــــ لوگ اعتبار بھی کر لیں ـــــ تو کامیابی یقینی ہے۔ مگر کیا عملاً یہ ممکن ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس صورتِ حال کے صحیح فہم و ادراک کے لئے فوری تقابل کے طور پر قیامِ پاکستان سے پہلے علامہ اقبال کی مثال دی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال غزالی کے مداح ہیں ابن عربی کے خوشہ چین ہیں (تصوف میں جمود اور بے عملی کے خلاف برہنہ شمشیر ہیں) مولانا روم کے مرید ہیں۔ جنوبی ایشیا کے مسلم عوام کے اجتماعی ضمیر نے اس 'شاعر بے نوا' ایک فردِ واحد جس کی کوئی جماعت نہیں، کی آواز پر لبیک کہی اور امت ڈھاکہ سے طورخم تک بیدار ہوگئی ـــــ انگریزی استعمار کے منصوبوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گئی اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کا قیام ممکن ہوگیا۔ چند سال قبل برطانیہ میں سرکاری کاغذات کے عام ہونے سے جو بات سامنے آئی کہ برطانوی حکومت نے اعتراف کیا ہے کہ برطانوی ہند کی تقسیم نہ انگریز کا منصوبہ تھا نہ ہندو چاہتا تھا یہ صرف ایک شاعر محمد اقبال علیہ الرحمتہ کی شاعری نے عوامی بیداری پیدا کر دی تھی جس سے تقسیم ہند ممکن ہوسکی۔

اسی طرح کا معاملہ گزشتہ صدی کی ایک دوسری شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے ان کے جوش اور جذبے اور جذبہ حریت و استخلاصِ وطن کا کون انکار کرسکتا ہے مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کے باوجود وہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں 'امام الہند' نہ بن سکے وجہ یہی تھی۔ وہ

چاہتے تو حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے خاندانی مناسبت سے تصوف یعنی غزالی کے نظریات کی اصلاح بھی کرتے اور قبول کر کے آگے بڑھتے تو حالات کیا ہوتے مگر ـــــــ اُنہوں نے اپنے نظریات کے لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے اعلیٰ مقصد کو بھی قربان کر دیا۔

اس مسئلے کی مزید توضیح کے لئے عرض ہے کہ کسی علاقے کے مسلمانوں کے اجتماعی نظریات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ان کی اصلاح کی کوششیں ہوسکتی ہیں۔مگر ان کو نظر انداز کر کے کوئی سیاسی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ برصغیر میں ایک صدی قبل امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کا حامل ہونا اور ان کی ترویج کا علم بلند کرنا اپنی جگہ ایک کام تھا مگر اس بنیاد پر عوامی پذیرائی اور تائید کے حصول کا دعویٰ یہ خلافِ عقل کام تھا۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت علامہ اقبال کی آفاقی نظموں شکوہ (1911ء)، شمع و شاعری (1912ء)، جوابِ شکوہ (1913ء) طلوعِ اسلام کے ساتھ خلافت اسلامیہ کے قیام اور اس کی آفاقیت اور عالمگیریت سے مسحور تھے اور یہ حقائق علامہ اقبال نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذخیرہ سے ہی نکال کر عوام کے سامنے رکھے تھے۔

آج بھی عوام 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی نظموں کے تصورات کے حامی ہیں۔اسلام کے سیاسی نظام کو نظام خلافت سمجھتے ہیں۔مساواتِ انسانی، حقوقِ نسواں کا تحفظ، پردہ، حریت، بھائی چارہ، معاشی عدل اور درویش حکمرانی کے تصورات ان کے خواب ہیں۔ جبکہ پاکستان کے موجودہ سیاسی منظر نامے میں نظامِ خلافت اور اس کے قیام کی اصطلاحات ہی ناپید ہیں۔علامہ اقبال کے افکار کا یہ سحر پاکستان کے عوام کی اجتماعی یادداشت میں آج بھی زندہ ہے بلکہ بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلم ضمیر سے بھی محو نہیں ہوسکا۔

یہ ایسے ہی ہے کہ آج سعودی عرب کے شہر ریاض میں علامہ اقبال کے نظریات کے فروغ کے لئے کام کیا جائے (کوئی کام کرنے دے گا یا نہیں یہ الگ بات ہے شاید جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی طرح کی وسعت قلبی وہاں سامنے نہ آسکے) مگر اس کام کے آغاز کے چند سال بعد ہی یہ سمجھ لینا کہ سارا عرب علاّمہ اقبال کے افکار کا مدّاح ہوگیا ہے یہ غیر منطقی بات ہوگی۔

ہمارے نزدیک جماعت اسلامی یا مولانا مودودی صاحب کے افکار کی عدمِ مقبولیت

کی یہ ناگزیر بنیادی وجہ ہے اور اس کے ہوتے ہوئے مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں بھی ان نظریات کی بنیاد پر جمہوری انداز کی کامیابی ناممکن ہے۔

گزارش ہے کہ ان سطور پر علمی گفتگو اور جذبہ اصلاح کے انداز سے ہی دیکھا جائے تو بہتر ہوگا ہمارے نزدیک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں قابل احترام ہیں۔ ماضی میں ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ علمائے ظاہر میں سے تھے مگر نظریات وہ تھے جو غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی مسلک کے باوجود روحانیت، روح روحانی ترقی تعلق مع اللہ اور اس طرزِ فکر کی دیگر تفصیلات جسے عرف عام میں تصوف کہتے ہیں اس کے پیروکار تھے۔

3

درسِ نظامی کی اصلاح وترقی

عربی زبان کی تعلیم وترقی کا انقلابی منصوبہ

الاستاذ محمد بشیر السیالکوتی
دارالعلم۔699، آب پارہ، مارکیٹ، اسلام آباد

الاستاذ محمد بشیر السیالکوتی پاکستان میں عربی زبان کی ترویج کے لیے ایک 'نشان' اور 'علم' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں رائج دینی مدارس کے نظام کا حلقہ اثر وسیع ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس میں قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور عربی پڑھائی جاتی ہے تاہم یہ عربی صدیوں پرانی کتابوں کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔

کتاب کے مصنف نے کتاب میں دینی مدارس میں عربی کی تعلیم کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کرنے پر زور دیا ہے تاکہ ہمارے فضلاء اور محققین عالم عرب میں جا کر عربی بول سکیں بلکہ اپنا علمی مافی الضمیر بھی بیان کر سکیں۔

اُصولی طور پر اس خواہش پر کوئی اختلاف نہیں کہ ہمارے دینی مدارس کے فارغ

التحصیل طلباء جب عملی زندگی میں قدم رکھیں تو اس قابل ہوں کہ آج کی عربی پڑھ سکیں، لکھ سکیں اور بول سکیں۔ اگر یہ ممکن ہو جائے تو دینی تعلیم کے فروغ میں کئی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ تاہم مصنف نے کئی علمی بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں جس سے اُصولی مشن پس پردہ چلا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک دینی مدارس کے وفاق یا دیگر قائدین کو اصولی طور پر عربی زبان پر ایسا عبور، کہ طلباء عملی زندگی میں (انگریزی زبان کی طرح) عربی عبارات پڑھ سکیں، عربی میں مضامین لکھ سکیں اور ضرورت پڑے تو عربی بول سکیں، دلانے پر قائل کر کے طریق کار ان پر چھوڑ دیا جائے تا کہ ہر مسلک کے لوگ اپنے ظروف واحوال کے مطابق اس اصولی موقف پر عمل درآمد کے لیے ضروری اقدامات کر سکیں۔

ہمارے نزدیک علماء، فضلاء کو یقیناً قرآن وحدیث کی زبان سیکھنا چاہیے اور اس پر عبور بھی ہونا چاہیے۔ تاہم دورِ خلافت راشدہ، دورِ بنواُمیہ، دورِ بنوعباس کے چھ سو سال میں ابتدائے اسلام کی طاقت کے باوجود اگر عربی عوام کی زبان نہیں بن سکی تو اب آئندہ عالمی خلافت کے وقت بھی اسلام کی بالادستی کے لیے عربی زبان کی عوامی سطح پر ناگزیر ہونا لابدی نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اے اللہ! ہم سب کو ہدایت نصیب فرما ہمیں متحد ہونے کی توفیق دے اور ہمیں ہمت اور قوت دے کہ ہم برما سے فلسطین تک پھیلے ہوئے مظالم کو روک سکیں۔ آمین

اقبال نے ہمارا متحدہ ہندوستان کا خواب چکنا چور کر دیا

(جیمز رامزے میکڈونلڈ، پرائم منسٹر برطانیہ)

تقسیم ہند کا اصل سبب کون؟

کیا اسلام کو جدیدیت کو اپنا لینا چاہیے یا اپنے بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے؟ دو ایسے مدارس کے درمیان جو اپنے قیام کے وقت جغرافیائی لحاظ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے، دینی نظریات کی اس چپقلش کو اس دَور میں قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اگلے 100 برس میں یہ معمولی دراڑ اسلام کو دو باہم برسرپیکار نظریات میں تقسیم کرنے والی ایسی صدا تھی جس کی بازگشت آج تک دنیا میں گونج رہی ہے۔ اس معمولی چپقلش کے ایک بحران کی صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے مدرسہ دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی آزادئ ہندوستان کے مشترکہ مقصد میں شریک تھے اور تعلیمی رجحانات کے اختلاف کو نظرانداز کرتے ہوئے دونوں اداروں کے طلبہ اور عملہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں برصغیر میں سامراجی حکومت کے خاتمہ کے لیے ہندوؤں کے ساتھ شامل تھے۔ لیکن قومیتی رجحانات اس کمزور اتحاد کی راہ میں حائل ہو گئے۔ ہندوستان جو مختلف ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا اور مغل حکمرانوں کے تحت متحد ہو گیا تھا برطانوی سامراج کے تحت تہذیبی اور مذہبی بنیادوں پر پارہ پارہ ہونے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک ہردلعزیز مسلمان شاعر اور مفکر نے جس کا نام محمد اقبال تھا، مستقبل کے آزاد ہندوستان میں مسلم اقلیت کی حیثیت کا سوال اٹھاتے ہوئے ایک اسلامی قومیتی نظریہ کی بنیاد رکھنا شروع کی۔ اقبال جنہیں کسی دور میں اپنی نظموں کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر سمجھا جاتا تھا، یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے یہودی انتشار عظیم (DIASPORA) کے انجام کے بارے میں اب انتہائی متفکر نظر آنے لگے، کیونکہ ''اقبال نے عیسائی یورپ کی ثقافتی اکثریت میں یہودی وحدانیت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا تھا اور انہیں یہ پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کا بھی یہی انجام ہوگا ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنی تہذیب کو ہندی قومیت کی بھینٹ چڑھا دیا تو آہستہ آہستہ وہ اس میں جذب ہوتے ہوئے معدوم ہو جائیں گے۔'' یہ بات پاکستان کے ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین اور اقبال کی سیاسی فکر پر لکھی گئی ایک کتاب کے ایڈیٹر فتح محمد صاحب نے بیان کی۔

اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک حواس باختہ اجتماع کے سامنے 29 دسمبر 1930ء کو اس صورت حال کا یہ حل رکھا کہ شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست ہو، ایک علیحدہ وطن جہاں مسلمانوں کا اپنا اقتدار ہو۔ اس تجویز کا ردعمل دھماکہ خیز تھا۔ اس وقت کا برطانوی وزیراعظم JAMES RAMSAY MacDONALD پکار اٹھا کہ متحدہ ہندوستان کے لیے ''ہماری تمام کاوشوں پر اقبال شاعر نے پانی پھیر دیا ہے۔'' اگلے ہی روز TIMES OF LONDON کے اداریہ نے مشرق وسطیٰ، ایران، افغانستان اور روسی سلطنت کے سرحدی علاقوں پر مشتمل ایک متحدہ اسلامی ریاست کے منصوبہ کا چرچا کیا۔

(ٹائم میگزین 13 اگست 2007ء) (ترجمہ شہرام اقبال)

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

عنقریب ایک خصوصی اشاعت

کا اہتمام کر رہا ہے

جس کا عنوان ہے:

جنوبی ایشیا میں

ھندو مسلم نظریاتی کشاکش

کا تاریخی جائزہ

آغازِ اسلام سے ایٹمی پاکستان تک

(610ء تا 2014ء)

اہل علم سے درخواست ہے کہ اس خصوصی اشاعت کے لیے قلمی تعاون فرمائیں۔ نیز موضوع سے متعلق تراشے، حوالہ جات اور مضامین ارسال فرمائیں یا مطلع فرمائیں۔

(ادارہ)

انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

کے اغراض ومقاصد

☆ عربی زبان کی تعلیم وترویج

☆ قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب وتشویق

☆ علومِ قرآنی کی عمومی نشرواشاعت

☆ ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت

جوقرآن مجید کی تعلیم وتعلّم کواپنا مقصدزندگی بنالیں

اورایک ایسی

قرآن اکیڈمی

کا قیام جوقرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو

وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرسکے

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَ الْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہ

عورت کا مقام :

میڈیا اور تاجر حضرات ذرا سوچیں!

اسلام نے عورت کو جو مقام اور احترام دیا ہے وہ کوئی دوسرا مذہب یا نظام نہیں دے سکا۔ اس کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ کے مطابق ''جنت ماں کے پاؤں تلے ہے۔'' اسلام نے عورت کو والدین اور شوہر دونوں کی وراثت میں بھی حصہ دار بنایا ہے جبکہ مغربی تہذیب نے آزادیٔ نسواں کے نام پر عورت کو شمع محفل بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حلال رزق کمانے کے لیے مرد کو بیرونِ خانہ اور عورت کو خاوند اور بچوں کی نگہداشت کے لیے اندرونِ خانہ الگ الگ ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ یورپ کے عیار مرد نے آزادیٔ نسواں اور یکساں حیثیت کے پرفریب نعرے پر اسے کولہو کا بیل بنا دیا۔ تاجر اور صنعت کار اپنی پروڈکٹ کی فروخت کے لیے عورت کے حسن اور نزاکت کا اشتہار دے رہے ہیں اور میڈیا اپنی ریٹنگ اور اشاعت بڑھانے کے لیے عورت کی عریاں اور نیم عریاں تصاویر شائع کر رہا ہے۔ تاجر طبقہ اور میڈیا یہ سوچے کہ وہ اپنی خواتین کے لیے یہ رول پسند کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فحاشی اور بے حیائی کو شیطانی عمل قرار دیا ہے اور شدید ترین انداز میں اس کی مذمت کی ہے۔ کیا چند ٹکوں کی خاطر اللہ کی ناراضگی مول لینا اور آخرت کے دائمی عذاب کا مستحق ہونا خسارے کا سودا نہیں۔ ذرا سوچئے!

من جانب: تنظیم اسلامی پاکستان